ماہنامہ

# حکمت بالغہ

## دسمبر 2011

## مدیر: انجینئر مختار حسین فاروقی

قرآن اکیڈمی

جھنگ پاکستان

فون اور فیکس:-0092-47-77628261

ای میل:hikmabaalgha@yahoo.com

ویب سائٹ:

http://www.hikmatbaalgha.com

http://www.hamditabligh.net

# قرآن مجید

کے ساتھ

# چند لمحات

سورۃ المعارج (70) آیات 19-35

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ ھَلُوْعًا O

بے شک انسان کم حوصلہ پیدا ہوا ہے

اِذَا مَسَّہُ الشَّرُّ جَزُوْعًا O

جب اسے تکلیف پہنچتی ہے تو گھبرا اٹھتا ہے

وَ اِذَا مَسَّہُ الْخَیْرُ مَنُوْعًا O

اور جب آسائش حاصل ہوتی ہے تو بخیل بن جاتا ہے

اِلَّا الْمُصَلِّیْنَ O الَّذِیْنَ ھُمْ عَلٰی صَلَاتِھِمْ دَآئِمُوْنَ O

مگر وہ نمازی

جو اپنی نماز کا التزام رکھتے (اور بلا ناغہ پڑھتے) ہیں

وَ الَّذِیْنَ فِیْٓ اَمْوَالِھِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ O

اور جن کے مال میں حصہ مقرر ہے

لِّلسَّآئِلِ وَ الْمَحْرُوْمِ O

(یعنی) مانگنے والے کا اور نہ مانگنے والے کا

وَ الَّذِیْنَ یُصَدِّقُوْنَ بِیَوْمِ الدِّیْنِ O

اور جو روزِ جزا کو سچ سمجھتے ہیں

وَ الَّذِیۡنَ ھُمۡ مِنۡ عَذَابِ رَبِّھِمۡ مُّشۡفِقُوۡنَ O

اور جو اپنے پروردگار کے عذاب سے خوف رکھتے ہیں

اِنَّ عَذَابَ رَبِّھِمۡ غَیۡرُمَاۡمُوۡنٍ O

بے شک ان کے پروردگار کا عذاب ہے ہی ایسا کہ

اس سے بے خوف نہ ہوا جائے

وَ الَّذِیۡنَ ھُمۡ لِفُرُوۡجِھِمۡ حٰفِظُوۡنَ O

اور جو اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرتے ہیں

اِلَّا عَلٰۤی اَزۡوَاجِھِمۡ اَوۡ مَا مَلَکَتۡ اَیۡمَانُھُمۡ

مگر اپنی بیویوں یا لونڈیوں سے کہ (ان کے پاس جانے پر)

فَاِنَّھُمۡ غَیۡرُمَلُوۡمِیۡنَ O

انہیں کچھ ملامت نہیں

فَمَنِ ابۡتَغٰی وَرَآءَ ذٰلِکَ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الۡعٰدُوۡنَ O

اور جو لوگ ان کے سوا اور کے خواستگار ہوں وہ حد سے نکل جانے والے ہیں

وَ الَّذِیۡنَ ھُمۡ لِاَمٰنٰتِھِمۡ وَ عَھۡدِھِمۡ رٰعُوۡنَ O

اور جو اپنی امانتوں اور اقراروں کا پاس کرتے ہیں

وَ الَّذِیۡنَ ھُمۡ بِشَھٰدٰتِھِمۡ قَآئِمُوۡنَ O

اور جو اپنی شہادتوں پر قائم رہتے ہیں

وَ الَّذِیۡنَ ھُمۡ عَلٰی صَلَاتِھِمۡ یُحَافِظُوۡنَ O

اور جو اپنی نماز کی خبر رکھتے ہیں

اُولٰٓئِکَ فِیۡ جَنّٰتٍ مُّکۡرَمُوۡنَ O

یہی لوگ باغہائے بہشت میں عزت و اکرام سے ہوں گے

صدق اللہ العظیم

# پاکستان کے ایک جدید اسلامی فلاحی ریاست بننے میں
# سب سے بڑی رکاوٹ
# فقہ اسلامی کی تدوینِ نو کا فقدان

انجینئر مختار فاروقی

**پس منظر** یورپ میں صنعتی ترقی، سائنسی برتری اور عسکری طاقت کے فروغ سے ساری دنیا متاثر ہوئی ــــــــ مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ سب سے زیادہ نقصان مسلمانوں کو ہوا۔ حقیقتاً مسلمانوں کو دوہرے نقصان سے دوچار ہونا پڑا۔ یورپی استعمار کے عالمی غلبے سے پہلے مسلمان دنیا کی واحد ترقی یافتہ مہذب قوت تھے، وقت کے ساتھ ساتھ اضمحلال آیا اور یہ عظیم سیاسی قوت زوال پذیر ہوگئی۔ یورپی اقوام نے آہستہ آہستہ دنیا پر اپنی عسکری قوت کے ذریعے ظلم وتشدد کا سہارا لے کر قبضہ کرلیا۔ اس مرحلہ پر مسلمانوں کو ایک صدمہ یہ تھا کہ یورپی اقوام نے مسلمانوں سے اقتدار چھینا تھا اور مسلمانوں کی طرف سے انتقامی جذبات کے خطرہ کی وجہ سے مغربی استعمار نے مسلمانوں کو سیاسی، معاشی، مذہبی اور نفسیاتی طور پر کچل دینے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ دوسرا صدمہ یہ تھا کہ مسلمان من حیث القوم یورپی طاقتوں کے غلام بن گئے۔ یورپی استعمار کے غلبے کا آغاز 1604ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے قیام سے شروع ہوا اور پہلی جنگ عظیم 1914ء-1918ء میں خلافت عثمانیہ کے خاتمہ پر یہ سیاہ دور ختم ہوا۔ اب مسلمان غلام تھے اور یورپی آقاؤں کی سازشوں کا نشانہ بھی تھے اور علمی، سائنسی اور صنعتی برتری سے مرعوب بھی۔

## اسلامی ریاست کا تصور نگاہوں سے اوجھل

سترہویں صدی میں پورا جنوبی ایشیا، مشرقِ وسطی، ترکستان، ایران، مشرقی نصف یورپ، سارا متمدن افریقہ اور انڈونیشیا ملائشیا مسلمانوں کے زیرنگیں تھا۔ پہلے افریقہ کے

مقبوضات مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل گئے پھر ملائشیا انڈونیشیا پھر جنوبی ایشیا اس کے بعد ایران ترکستان، مشرقی یورپ بھی ہاتھ سے جاتا رہا۔ جزیرہ نمائے عرب اور مشرقِ وسطی بھی پہلی جنگ عظیم کے بعد نظریۂ وطن پرستی کی بھینٹ چڑ گئے اور ترکی میں بھی خلافت عثمانیہ کا خاتمہ ہوگیا اور ترکی نے یورپی نظریات قبول کر کے جمہوریت اور رومن لاء اختیار کر لیا۔

اس تین صدیوں پر جاری زوال کے عمل سے مسلمانوں کے ذہنوں سے اسلامی ریاست کا تصور، آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل کے مصداق محو ہوتا چلا گیا۔ جنوبی ایشیا میں تحریک شہیدین اور جنگ آزادی 1857ء کے واقعات یہی پتہ دیتے ہیں کہ غلامی میں جکڑے جانے پر پہلے احساس تھا کہ اسلامی ریاست قائم ہو جائے ــــــــ مگر وقت کے ساتھ اور یورپی استعمار کے ظالمانہ اور سفاکانہ طرزِ عمل سے مسلمان خاموش ہوتے چلے گئے۔

بیسویں صدی کے آغاز تک (1900ء کے بعد کے کچھ برس) مسلمانانِ ہند اپنے دورِ غلامی کے باوجود سلطنت عثمانیہ اور ترکی سے رہنمائی اور مدد (کمک) کے منتظر اور متمنی تھے۔ حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ کی ریشمی رومال تحریک اسی فلسفے اور نظریے کی بنیاد پر اٹھائی گئی تھی اور حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ 1916ء میں حرمین شریفین، خلافت عثمانیہ سے امداد اور حمایت کے مذکرات کے سلسلے میں ہی گئے تھے کہ گرفتار ہو گئے۔ 1924ء میں خلافت کی تنسیخ سے مسلمانوں کی امیدیں ختم ہو گئیں اور قومی و ملّی سطح پر مایوسی انتہا کو پہنچ گئی۔

تنسیخ خلافت پر سارا عالم اسلام خاموش رہا۔ مگر برطانوی ہند میں تحریک خلافت کے نام سے ایسی زبردست تحریک چلی کہ برطانوی اقتدار ڈگمگا گیا اور ہندو نے سوچا کہ کہیں برطانیہ کی واپسی پر اقتدار دوبارہ مسلمانوں کے ہاتھوں میں نہ چلا جائے گاندھی جیسا کٹر ہندو بھی تحریک خلافت میں شامل ہو گیا ورنہ کہاں ہندو ذہنیت اور کہاں تحریک خلافت کے ذریعے بحالی خلافت کا نعرہ۔ یہ مسلم بیداری علامہ اقبال کے شاعرانہ کلام میں شکوہ جواب شکوہ طرز کی نظموں کی بدولت پیدا ہوئی تھی جس کا اظہار تحریک خلافت کے دوران ہوا۔

---

## جدید اسلامی ریاست کا تصور

برطانوی ہند میں 1857ء کے بعد کے دورِ غلامی میں جب امن و امان کی صورت حال بہتر ہوئی، ڈاک کا نظام اور ریل کے ذریعے دور دراز کے پرامن اسفار کا نظام قائم ہوا تو حصول علم اور باہمی رابطوں میں بہتری کے مواقع پیدا ہو گئے۔ پریس کی ایجاد کے بعد مغربی علوم کے پھیلاؤ اور جدید مغربی افکار و نظریات سے آگہی سے امت مسلمہ کے ذہین و فطین عناصر کو اسلامی تعلیمات کو ایک نئے انداز میں دیکھنے کا موقع ملا۔

مسلمانوں کے زوال سے ایک طرف مسلمانوں کی حکومتیں ختم ہو گئیں اور ریاست و حکومت کا روایتی تصور اور کائنات کے یونانی تصورات بھی طاق نسیاں ہو گئے۔ دوسری طرف مغربی علوم کی ترویج سے مغربی ترقی کی روشنی میں مسلمانوں کے لیے اپنے نظریات کی بنیاد پر ایک جدید ریاست کی تشکیل بھی زیر بحث آ گئی۔

تحریک خلافت میں برطانوی ہند کے طول و عرض میں بحالی خلافت کا نعرہ لگا اور تمام مسلمان اس تحریک میں سرگرم ہو گئے تو یہ سوال ذہنوں میں ابھرنے لگا کہ اب جدید دور میں بحالئ خلافت کا مطلب کیا ہوگا؟ اور نظام خلافت سے مراد کیا ہوگی؟ اور اب طرز حکومت کیا ہوگا؟۔

دور حاضر میں جدید اسلامی ریاست کے لیے مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم نے حکومت الٰہیہ کا نعرہ لگایا پھر اسے اسلامی حکومت کا نام دیا گیا پھر مغربی تصورات کے تحت اسلامی نظام کی اصطلاح سنائی دینے لگی، پھر اس میں قرآن مجید کا فکر شامل ہوا تو شہادت علی الناس اور اقامت دین کی خالص دینی اصطلاحات بھی اسلامی لٹریچر کا حصہ بن گئیں۔ روسی انقلاب کا چرچا ہوا اور اس کی دنیاوی برکات کا ڈھنڈورا پیٹا گیا تو جدید مسلمان دانشوروں نے 'اسلامی انقلاب' کی اصطلاح وضع کر لی۔ جدید تعلیم سے آراستہ مسلمان دانشوروں کے اس ذہنی علمی سفر میں مسلمان نوجوانوں کو جدید اصطلاحات میں اسلام کی تعلیمات کا عکس نظر آیا تو مسلم امت کا ایک معتدبہ حصہ ان خیالات و نظریات کو اپنا کر ــــــــ حکومت الٰہیہ، اسلامی حکومت، اسلامی نظام حیات اور اسلامی انقلاب کی اصطلاحات استعمال کرنے لگا بلکہ شہادت علی الناس اور اقامت دین کی اصطلاحات بھی آہستہ آہستہ منبر و محراب سے بھی سنی جانے لگیں۔

1910ء سے 1947ء کا یہ دور امت مسلمہ کے جدید تعلیم یافتہ طبقے کو خود اعتمادی اور اسلام کی تعلیمات پر گہرا یقین فراہم کرنے کا کام کر گیا جس سے مجموعی طور پر امت مسلمہ کے بہت بڑے حصے پر عام طور پر اور جدید تعلیم یافتہ طبقے میں خاص طور پر مغربی علوم کی بالادستی اور سائنسی برتری کے ماحول میں جو خود شکستگی (INFERIORITY COMPLEX) پیدا ہو رہی تھی اس میں آہستہ آہستہ کمی آتی چلی گئی اور امت مسلمہ کے ذہین عناصر میں عصر حاضر میں بھی ایک جدید مسلم فلاحی ریاست کا خیال جڑ پکڑنے لگا۔ تحریک خلافت کے دوران مسلمانوں کو بالعموم اس سوال سے دوچار ہونا پڑا کہ عصر حاضر میں اسلامی ریاست کیا ہو؟ گی اس کے خدوخال کیا ہوں گے؟ اسلامی حکومت کی نوعیت کیا ہوگی؟ حکمران کا نصب وعزل (حکمران کا منصب سنبھالنا اور ضرورت پڑنے پر اسکی معزولی) کیسے ہوگا؟ عدلیہ، انتظامیہ، اسمبلیاں کیسے وجود میں آئینگی؟ آئین کیا ہوگا؟۔

ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔ جب یہ سوال پیدا ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے امت کے ذہین عناصر کو کھڑا کر دیا جنہوں نے مسلمانوں کی بروقت اور صحیح سمت میں صحیح رہنمائی فرمائی۔

## جدید اسلامی ریاست کی تشکیل کیسے ہوگی؟

امت مسلمہ کے باشعور اور باصلاحیت طبقے کو یہ احساس ہوا کہ آج کے دور میں اسلامی ریاست کا تصور کیا ہے؟ اس کی بنیاد کیا ہوگی؟ اس کے خدوخال کیا ہوں گے؟۔ اس خیال نے آگے بڑھ کر عملی صورت یہ اختیار کی کہ مدراس (جنوبی ہند) کے مسلمان نوجوانوں نے ایک پروگرام کے تحت علامہ اقبال کو دعوت دی کہ وہ مدراس آکر چند لیکچرز میں اسلام کے عقائد، ایمانیات اور ریاست کی تشکیل سے متعلق ہماری رہنمائی فرمائیں۔ علامہ اقبال نے 1929ء میں مدراس کا سفر کیا اور وہ مشہور چھ خطبات ارشاد فرمائے جو اب RECONSTRUCTION OF RELIGIOUS THOUGHT IN ISLAM کے نام سے مطبوعہ ملتے ہیں ان کا اردو ترجمہ بھی ہو چکا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ علامہ اقبال نے وقت کی اعلیٰ ترین علمی سطح پر اسلام کے بنیادی تصورات، اللہ پر ایمان، آخرت پر ایمان، وحی پر ایمان، نبوت و رسالت کی ضرورت اور اہمیت پر سیر حاصل بحث فرمائی اور جدید نفسیات، اعلیٰ طبیعات، اعلیٰ ریاضی اور فلسفہ کو دین کے بنیادی تصورات کے ساتھ جوڑ دیا جس سے مغربی گمراہ کن نظریات کے سیلاب میں بہتے مسلمان

نوجوان کو رُک کر سوچنے اور اسلام سے وابستہ رہنے کے جذبات کو جلا ملی۔

انہیں لیکچرز میں جدید دور میں اسلامی ریاست کی تشکیل، قانون سازی اور عصر حاضر میں اجتہاد جیسے مسائل بھی زیر بحث آئے اور یوں ــــــــــ مسلمان نوجوانوں کے سامنے عصر حاضر میں اسلامی ریاست کے قیام کا امکان ــــــــــ روز روشن کی طرح واضح ہو گیا۔

## اسلامی ریاست کا خواب.....عوام کا نعرہ بن گیا

برطانوی ہند کے مسلمانوں کے اجتماعی ضمیر کو علامہ اقبال کی شاعری نے جگایا شکوہ / جوابِ شکوہ جیسی نظموں کے ذریعے احساس زیاں کا شعور بیدار ہوا اور

؎ وقت فرصت ہے کہاں کام ابھی باقی ہے
نور توحید کا اتمام ابھی باقی ہے

یا ؎ قوت عشق سے ہر پست کا بالا کردے
دہر میں اسم محمدؐ سے اجالا کردے

یا ؎ کی محمد سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے؟ کیا لوح و قلم تیرے ہیں

یا ع میرے درویش خلافت ہے جہانگیر تیری

یا ؎ تا خلافت کی بنا دنیا میں ہو پھر استوار
لا کہیں سے ڈھونڈ کر اسلاف کا قلب و جگر

کے الفاظ نے ایک عوامی بیداری کی لہر پیدا کر دی جس نے پہلے تحریک خلافت کی شکل اختیار کی پھر 'روح' ابھی 'بدن' کی تلاش میں ہی تھی کہ خود علامہ اقبال نے 1930ء کے خطبہ الٰہ آباد میں برطانوی ہند کے شمال مغربی علاقے میں دوقومی نظریہ کی بنیاد پر ایک آزاد مسلم ریاست کا تصور پیش کر دیا۔ 1930ء کے خطبہ الٰہ آباد سے مسلمانوں کی اجتماعی سوچ کو ایک رخ مل گیا اور مسلمان ایک اسلامی ریاست کی منزل کی طرف بڑھنے لگے۔

گول میز کانفرنسیں، مولانا محمد علی جوہر کی برطانیہ میں وفات اور آزادی کے چرچے اس بات کے غماز ہیں کہ برطانوی حکومت کے اعلیٰ ایوانوں میں مسلم عوام کی بیداری نے ہلچل پیدا

کردی تھی۔مسلمانوں کی بیداری اور تحریک خلافت میں پورے ہند کے مسلمانوں میں قربانی کے جذبات کے اظہار نے امت مسلمہ میں سیاسی شعور کی بیداری کا چرچا عام کردیا۔ان حالات میں مسلم ریاست کا تصور مسلم زعماء کے ذہنوں سے نکل کر عوامی نعرہ بن گیا۔

## ایک جدید ریاست کے تقاضے

علامہ اقبال بجا طور پر مفکر پاکستان ہیں اور خطبات مدراس کے بعد خطبہ الٰہ آباد کے وقت سے انہیں اس 'تقدیر مبرم' کے حقیقت کا روپ دھارنے کا یقین کامل تھا اور انہوں نے ہی اولین اس ریاست کے عصر حاضر میں ناگزیر تقاضوں کا ادراک بھی کیا۔

1۔ عصر حاضر میں ایک آزاد ریاست کے لیے ایک آئین کی ضرورت سب سے اہم اور مقدم ہے۔علامہ اقبال نے اس کے لیے اپنی شاعری میں قرآن مجید کو مسلمانوں کی مستقبل کی ریاست کا آئین قرار دیا اور اسی کو اپنی شاعری کے ذریعے عام کیا۔تحریک پاکستان کے دوران قائداعظم محمد علی جناح نے بھی اسی بات کا بار بار اعلان فرمایا۔

2۔ جدید ریاست کے لیے آئین کے بعد انتظامیہ، مقنّنہ اور عدلیہ کا تصور آتا ہے۔عدلیہ آج کی ریاست کا اہم ستون ہے عدلیہ کے ساتھ ایک قانون اور قانون سازی کا طریقہ آتا ہے۔

3۔ فوج اور تعلیم بھی کسی ریاست کے لیے ناگزیر ستون کی حیثیت رکھتے ہیں۔فوج ملک کی جغرافیائی سرحدوں کی حفاظت کرتی ہے تو تعلیم کسی ریاست کے اساسی نظریات کی آبیاری کا کام کرتی ہے اور ریاست کے نظریات کو من وعن اگلی نسل میں منتقل کرنے کا کام کرتی ہے۔

پچاس ساٹھ سال میں جب ریاست کے بانی اور ان کے 'حواری' اور بااعتماد و مخلص رہنما دنیا سے رخصت ہوجاتے ہیں اور قیادت کا بوجھ اگلی نسل کے کاندھوں پر آتا ہے تو تعلیم کے میدان میں محکم نظریاتی اساس پر ٹھوس کام کا فقدان قوم اور ریاست کو افراتفری (ANARCHY) میں مبتلا کرسکتا ہے۔علامہ اقبال نے ضربِ کلیم میں تعلیم کے اصول اور اس کی اہمیت بھی واضح فرمائی۔

4۔ اسی طرح عدلیہ کی اہمیت کے پیش نظر ایک مدوّن اسلامی قانون جیسے کام کا بیڑہ علامہ اقبال نے خود اٹھایا اور اس کی اہمیت کا احساس فرمایا اور اس کی طرف عملی اقدامات بھی فرمائے۔

## اسلامی ریاست کے لیے مدوّن اسلامی قانون کی ضرورت

آج کسی ملک کے قیام اور ریاست کے وجود میں آنے کے ساتھ ہی ایک مدوّن قانون کی ضرورت انتہائی اہمیت کی حامل ہے۔ اسلامی ریاست ایک نظریاتی ریاست ہوتی ہے اور اس ریاست کا ہر شعبہ اور ہر بازو اسی نقطہ سے آگے بڑھے تو ریاست ترقی کر کے کامیابی کی منزلیں طے کرتی ہے جب صورت حال برعکس ہو تو ریاست زوال پذیر ہو جاتی ہے۔

علامہ اقبال نے برطانوی ہند کے مسلمانوں کے جذبوں اور منگوں کی سرزمین مستقبل میں قائم ہونے والی اسلامی ریاست کے لیے ایک مدوّن اسلامی فقہ کی ضرورت کو محسوس کیا اور یہ ان کی عظمت ہے کہ انہوں نے اپنے وسیع علم، 'قانون' کی تعلیم اور اپنے پیشہ ورانہ تجربہ (LEGAL PRACTICE) کے باوجود خود اکیلے کرنے کی بجائے اسلامی مآخذ قانون ـــــــــ قرآن وحدیث کے معروف علماء سے رابطہ فرمایا۔

چنانچہ یہ بات علامہ اقبال کے قدردانوں پر عیاں ہے کہ اس کام کے لیے پہلے انہوں نے مولانا محمد انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ جو ایک عبقری کی حیثیت رکھتے تھے ان سے رابطہ فرمایا اور خط و کتابت رہی کہ آؤ مل کر دور جدید کے تقاضوں کے مطابق فقہ اسلامی کی تدوین نو کریں جو اسلامی ریاست کی ضرورتوں کو پورا کر سکے۔ اللہ تعالیٰ کو یہی منظور تھا کہ 1933ء میں مولانا کشمیریؒ کا انتقال ہو گیا۔ علامہ اقبال نے جامعہ ازہر مصر سے رابطہ فرمایا کہ عربی اور انگریزی جاننے والا کوئی عالم دین میسر آ جائے تو اسلامی فقہ کی تدوین کا کام ہو سکے گا مگر وہاں سے کوئی مناسب آدمی میسر نہ آ سکا۔

علامہ اقبال کی دوررس نگاہیں ملک کے اندر حیدرآباد دکن میں احیائے اسلام کے کام میں مگن مولانا مودودی رحمہ اللہ پر پڑیں تو ان سے خواہش ظاہر کی کہ وہ مستقبل کی اسلامی ریاست ہی کے علاقے پنجاب میں آ جائیں تو یہ ناگزیر کام شروع ہو سکے۔ مولانا مودودیؒ اس بات پر آمادہ ہو گئے۔ چوہدری نیاز علی خان سے بھی ان کی ملاقاتیں تھیں جو انہیں پنجاب میں پٹھانکوٹ میں آ کر کام کرنے کی دعوت دیتے رہتے تھے۔ مولانا مودودی رحمہ اللہ پنجاب منتقل ہو گئے اور پٹھانکوٹ میں آ ڈیرہ لگایا۔ مگر نیرنگیٔ تقدیر کہ ابھی آ کر علامہ اقبال سے اس موضوع پر ابتدائی ملاقات بھی نہ ہوئی تھی کہ اپریل 1938ء میں علامہ اقبال کا وصال ہو گیا (اللہ تعالیٰ ان پر اپنی رحمتیں نازل

فرمائے۔آمین)

ہر شخص اپنے دائرہ کار اور قوت کار کے مطابق ہی مکلّف اور اللہ تعالیٰ کے ہاں جواب دہ ہے۔ بہر حال علامہ اقبال کی شدید خواہش کے باوجود اس سمت میں کوئی پیش رفت نہ ہوسکی۔

## فقہ اسلامی کی تدوین نو کی اہمیت

فقہ اسلامی کی تدوین نو کے کام کو ہمارے نزدیک مولانا مودودیؒ اپنی دیگر مصروفیات کے باوجود آگے بڑھاتے تو اسلامی ریاست کے ایک اہم ستون کی مضبوطی کا کام ہوجاتا ہے اور یہ کام علامہ اقبال کے اعتماد کی وجہ سے ان کے ذمے بھی تھا مگر افسوس وہ اس کام کو سرے سے ہاتھ ہی نہیں لگا سکے اور اس رُخ پر کوئی پیش رفت نہ ہوسکی۔ اس کام کی اہمیت کا نظری طور پر احساس دلانا اپنی جگہ اہم ہے اور ایک حقیقت کا اظہار ہے۔ اس عظیم الشان کام کی اہمیت کا اندازہ ذیل کے واقعہ سے عام قاری بھی کرسکتا اور وہ واقعہ یہ ہے۔:

قیام پاکستان کی عظیم الشان کامیابی کے بعد اسلامی ریاست کی تشکیل کے عمل میں جب قانون کے شعبہ میں عدلیہ کے لئے مدون اسلامی فقہ (جو عصر حاضر میں عدلیہ کے نظام کی ضرورت پوری کرسکے) کی ضرورت سامنے آئی تو افسوس صد افسوس کہ کسی رہنما اور اسلامی سکالر کے پاس اس وقت کہنے کو کچھ نہیں تھا اور سوائے شرمندگی اور ندامت کے آنسوؤں کے ــــــــ سب کا دامن خالی تھا۔

یہ مرحلہ قیام پاکستان کے فوراً بعد اس وقت پیش آیا جب پاکستان کی دستور ساز اسمبلی کا اجلاس ہوا ــــــــ قائداعظم نے بطور گورنر جنرل حلف اُٹھایا۔ اقتدار تاج برطانیہ سے مسلمانوں کو منتقل ہوگیا۔ اس آزاد خداداد اسلامی ریاست کے لئے قانون کا سوال اُٹھا کہ اس ملک کا قانون کیا ہوگا؟ ــــــــ خاموشی ــــــــ جواب ندارد ــــــــ ایک خلا تھا۔ علامہ اقبال کی مستقبل بینی اور عبقریت و ذہانت کی داد دیجیے جو اس ضرورت کو 15 سال پہلے محسوس کررہے تھے۔ بالفرض یہ اہم کام سرانجام پاچکا ہوتا ــــــــ تو فقہ اسلامی کی تنفیذ منٹوں کا کام تھا۔ اس نازک لمحے کا ادراک نہ کرسکنے اور اس کو 'امر' نہ کرپانے کی وجہ سے بعد کی بڑی بڑی تحریکیں بھی بے اثر ثابت ہوئیں اس لئے کہ 'بس' نکل گئی تھی (انگریزی میں کہتے ہیں

YOU HAVE MISSED THE BUS)اب آئندہ کسی اسی طرح کے مناسب موقع کا انتظار کرو۔65 سال سے ملک نفاذ اسلام اور نفاذِ شریعت کے لئے ترس رہا ہے اور اس کا علاج کسی کے پاس نہیں ہے اور مسلمان عوام جنہوں نے اسلام کے عدل اجتماعی اور نظام خلافت کے کفالت عامہ کے تصورات کے لئے ملک پاکستان کے لئے بے پناہ قربانیاں دی تھیں ــــــــ آج سکتے کے عالم میں ہیں بلکہ صورت حال یہ ہے کہ بقول اقبال

؎ وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا
کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

بلکہ مسلمانانِ پاکستان آج ''لمحوں نے خطا کی ہے صدیوں نے سزا پائی ہے'' کا مصداق کامل بنے ہوئے ہیں۔

آج مسلمانانِ پاکستان کے زعماء، علماء فضلاء اور سیاسی رہنماؤں کو اس کوتاہی کا احساس تک نہیں ہے اور یہ کمی آج تک پوری نہیں ہوسکی۔ شاید اہل دل پر سکتہ (HEART ATTACK) طاری ہوجائے اگر انہیں معلوم ہو کہ وہ تدوین شدہ فقہ اسلامی جس کا نفاذ ہوسکے آج بھی مدون (تیار شدہ) موجود نہیں ہے' جسے وقت پڑنے پر نافذ کیا جاسکتے۔

قیام پاکستان کے بعد دستور ساز اسمبلی کے اجلاس میں پھر یہ واقعہ پیش آیا۔ چونکہ ملک تو ایک دن بھی بغیر عدالتوں اور بغیر مدوّن قانون کے نہیں چل سکتا؛ لہٰذا دل پر پتھر رکھ کر انگریز کے پہلے سے جاری کالے قانون 'تعزیراتِ ہند' کو 'تعزیرات پاکستان' کا نام دے کر نافذ کر دیا گیا اور وہ قانون آج بھی مضبوطی سے نافذ ہے۔ اس لئے کہ گاڑی غلط ٹریک پر چلی جائے تو واپس اصل ٹریک پر لانا بہت مشکل ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ عدلیہ، پولیس، تربیتی ادارے اور سرکاری اہلکاروں کے متعلق قواعد وضوابط سب کے سب اُسی انگریزی دور کے بنے بنائے نافذ العمل ہوگئے۔

افسوس! غیر اسلامی قانون کی جس نحوست سے نجات کے لئے ساری تحریک چلائی گئی تھی، سارے جتن کیے تھے، بے پناہ قربانیاں دی تھیں ــــــــ وہ فوری نتیجے کے اعتبار سے بے اثر اور بے نتیجہ ہوگئیں۔ جب قانون اور اقدار وہی ہیں طور طریقے وہی رہے تو ــــــــ لامحالہ اس معیار پر پورا اترنے والا طبقہ بھی وہی ٹھہرا ــــــــ جو انگریز کے دور سے انتظامیہ پر قابض تھا

اور نظام حکومت چلا رہا تھا اور تبدیلی کے خواہش مند طبقات اپنی اور اپنے رہنماؤں کی کوتاہی سے نفاذِ اسلام کی منزل تک نہ پہنچ سکے اور حسرت اس بات کی ہے کہ آج بھی صورتحال وہی روزِ اوّل والی ہی ہے۔ اس سمت کوئی مضبوط اور حوصلہ افزا پیش رفت نہیں ہوسکی۔

## اسلامی حکومت کے لئے فقہ اسلامی کی تدوین کی ضرورت واہمیت کی وضاحت کے لئے ایک مثال

شاید اوپر درج سطور سے ہمارے کچھ قارئین کو بات واضح نہ ہوسکی ہو اور ریاست کے معاملات میں ناگزیر ضرورتوں کا صحیح ادراک ایک عام آدمی کے لئے بہت مشکل ہی ہوتا ہے اس لیے کہ یہ ایک فنی نوعیت کا مسئلہ ہے جو اس شعبہ میں طویل تجربہ اور مطالعہ کا متقاضی ہے۔ ذیل میں تاریخ اسلامی میں دوسری صدی ہجری کی ایک مثال پیش خدمت ہے۔ بات ذرا طویل ہے ذرا غور سے پڑھیں۔

☆ دورِ نبوی ﷺ میں اسلامی ریاست تشکیل پا رہی تھی اور مدنی دور کے دس سال میں مختلف مراحل سے گذر کر فتح مکہ کے وقت اسلامی ریاست قائم ہوگئی۔ اگلے تین سالوں میں بعض خارجی دشمنوں (THREATS) سے پنجہ آزمائی رہی۔ یہ عوامل سیاسی اور عسکری بھی تھے اور مذہبی بھی، رومی اور ایرانی بھی مخالف تھے اور یہود و نصاریٰ بھی اور ان کے ایجنٹ جھوٹے مدعیان نبوت بھی۔

آپ ﷺ کے وصال (11ھ) کے بعد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سریر آرائے خلافت ہوئے تو ان کا مختصر دور بھی انہیں انقلاب دشمن (ANTI-REVOLUTIONARY) فتنوں کی سرکوبی میں گذر گیا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں استحکام آیا اور اسلامی ریاست کے خدوخال واضح ہونا شروع ہوئے۔ کفالت کا نظام پولیس کا نظام، باقاعدہ مسلح افواج کا نظام، صوبوں کا نظام، مشاورت کا نظام وغیرہ تشکیل پا گئے۔

عدلیہ کے لئے بطور جج ــــــــ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک تربیت یافتہ جماعت موجود تھی اور پھر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھی ــــــــ ان کے براہ راست شاگرد موجود تھے۔ ہر صحابی رضی اللہ عنہ بذات خود ایک مثالی شخصیت تھا اور اکابر صحابہ رضی اللہ عنہم کی جماعت نگرانی کے لئے موجود تھی

اور ایک شجر سایہ دار کی طرح اسلامی ریاست کے معاملات کو صحیح سمت میں آگے بڑھانے کے لئے مسلمانوں کو سازگار ماحول فراہم کر رہی تھی۔

☆ یہ سادہ نظام اس دور تک ممکن تھا کہ ابھی سلطنت اتنی وسیع نہیں ہوئی تھی اور انتظامی معاملات بھی پیچیدہ نہیں تھے۔ خلیفہ وقت خود رات کو رعایا کے حالات کا جائزہ لیتا تھا اور فیصلے خلیفہ کے پاس ہی آتے تھے۔ آج کی سپریم کورٹ 'اعلیٰ عدلیہ' کا شعبہ دربار خلافت میں جمع تھا۔

☆ خلافت راشدہ کے بعد جب خاندانی حکومت آئی اور ملوکیت کے سائے گہرے ہوتے چلے گئے تو ایک طرف امت مسلمہ میں ایمان کمزور ہوا، عمل میں اضمحلال آیا اور قبائلی عصبیت علاقائی عصبیت اور لسانی عصبیت بھی آڑے آنے لگی دوسری طرف صحابہ کرام ﷺ کی مقدس جماعت دنیا سے رخصت ہوگئی ان کے براہ راست شاگرد روشنی کے مینار تھے مگر صحابہ جیسی جاذبیت، کشش اور کردار ممکن نہیں تھا۔ لہٰذا دورِ بنواُمیہ کے نصف آخر میں مجموعی طور پر ریاستی معاملات میں ضعف آ گیا اور اقتدار کی رسہ کشی سے ریاست کے ستون کمزور پڑ گئے عدل وانصاف کے تقاضے پامال ہونے لگے۔

☆ اس کی تفصیل کا موقع نہیں مگر اس عنوان کی مناسبت سے اتنی گذارش ہے کہ سلطنت وسیع ہوگئی عدالتی نظام میں عام شہری عدالت اور مرکزی اعلیٰ عدالت تک کئی درجے بن گئے اسی ماحول میں عدالتی نظام میں ججوں کا تقرر اور تربیت کی ضرورت کا احساس ہوا اور علاقائی عدالتوں کے لئے مدون قانون کی ضرورت کا احساس ہوا ــــــــ تاکہ دور دراز شہری عدالتوں میں جج کے صوابدیدی اختیارات کم ہوں اور شق وار مدون قانون ہو تاکہ ذاتیات سے بالاتر ہوکر فیصلے ہوں اور انصاف کے تقاضے پورے ہوں۔ اس ضرورت کے تحت فقہ اسلامی کی تدوین اوّل کی ضرورت پیش آئی اس لئے کہ آج کی اصطلاح میں سپریم کورٹ لیول (یا ہائی کورٹ لیول) پر تو کوئی اُصولی بحث اور نئی قانونی موشگافیوں کی گنجائش ہوتی ہے مگر ضلعی سطح پر فوجداری اور دیوانی معاملات میں قرآن وسنت سے براہِ راست رہنمائی اخذ کرنا طوالت طلب بھی ہے اور عملاً ناممکن بھی۔ اس لئے علاقائی عدالتوں (LOWER COURTS) کے لئے مدون قانون اور دیگر عدالتی ضابطوں کی پاسداری ضروری ہے اور یہ پابندی حالات کے تغیر اور علاقائی، لسانی، قبائلی

عوامل کی موجودگی میں ناگزیر ہے ورنہ انصاف کی توقع ایک موہوم شئے بن جاتی ہے۔

اس ضرورت کے احساس کے تحت کئی کوششیں شروع ہوئیں اور سب سے کامیاب کاوش حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی تھی وہ اس وجہ سے بھی قابل قدر تھی کہ اُنہوں نے اپنی ذات میں صرف اپنے شاگردوں کو بٹھا کر قانون مدون نہیں فرمایا بلکہ چالیس اہل علم کی جماعت میں فقہ اسلامی کی تدوین ہوئی اور اسلامی سلطنت کے دور دراز علاقوں میں بیٹھے قاضیوں (ججوں) کی صحیح رہنمائی کے لئے فرضی اور ممکنہ صورتوں کی نشاندہی کر کے ان کے لیے اسلامی ضابطے واضح کیے گئے تا کہ ایک طرف مقامی ججوں کی رہنمائی ہو سکے اور دوسری طرف مملکت کے تمام علاقوں میں قانون کی یکسانیت اور ہم آہنگی بھی ہو تا کہ ایک قاضی کے دوسرے علاقے میں تبادلہ یا نقل مکانی سے مشکلات پیدا نہ ہوں اور تیسرا یہ کہ عدالتی نظام میں ججوں کے ساتھ دوسرے معاون اہل کاروں کی رہنمائی اور تربیت بھی ممکن ہو سکے۔

حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ جب فقہ اسلامی کی تدوین کا کام سرانجام دے رہے تھے بظاہر یہ کام خشکی پر کشتی چلانے کی کوشش لگ رہا تھا۔ مگر اُن کی دور بین نگاہیں اُمت مسلمہ کی مجموعی مصالح اور مملکت اسلامی کے مفاد پر تھیں۔ دورِ بنواُمیہ کے اواخر میں جب بنوعباس ان کے مقابل ہو گئے اور کشت وخون کے بعد بنوعباس نے اپنی حکومت مستحکم کر لی۔ اس وقت اسلام کی وسیع و عریض سلطنت کیلئے ایک یکساں شق وار قانون کی ضرورت پیش آئی تا کہ حکمرانوں کی ذاتی اغراض اور مہم جوئی اپنی جگہ جاری رہنے کے باوجود عوام کو تو انصاف کے ذریعے سکون (RELEIF) مل سکے۔ سلطنت عباسی کی اسی ضرورت کو حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی اس کاوش نے پورا کیا ہے جو اُنہوں نے بڑی محنت اور دیدہ ریزی سے فقہ اسلامی کی تدوین میں کی تھی۔ فقہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ سرکاری طور پر نافذ ہوگئی اور یہی فقہ اگلے پانچ سو سال سرکاری مذہب کے طور پر نافذ رہی۔

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی تدوین فقہ سے اختلاف ممکن تھا، شوافع اور حنابلہ نے اختلاف کیا مگر فقہ کی تدوین سے کسی کو انکار ممکن نہیں تھا۔

ذرا غور کیجئے! اگر سلطنت بنوعباس کو فقہ حنفی کی صورت میں مدون فقہ اسلامی میسر نہ آتی تو عباسی سلطنت کو نہ استحکام ملتا اور نہ اسلام اور اُمت مسلمہ کو دنیا میں سکون ملتا، عوام کو عدل و

انصاف میسر نہ آتا اور یوں ظلم و جور کی حکمرانی ہوتی ــــــــــ باہمی خانہ جنگی اور ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے لئے قتل و غارت اور لشکر کشی جاری رہتی۔

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی یہ عظمت ہے اور اُمت مسلمہ پر احسان ہے کہ اُنہوں نے بروقت ایک اجتماعی و ملی ضرورت کا نہ صرف احساس کیا اور اس کو آگے بڑھ کر پورا بھی کر دیا۔

## اسلامی ریاست پاکستان

علامہ اقبال کو مستقبل کی اسلامی ریاست کی اس ضرورت (دورِ حاضر کی مدوّن فقہ اسلامی) کا احساس 1932ء سے ہو گیا تھا مگر حالات سازگار نہ ہوئے کہ یہ کام پایۂ تکمیل کو پہنچتا۔ افسوس اس بات کا ہے کہ علامہ اقبال کے مداحوں اور شارحین میں سے بھی کسی کو اس عظیم الشان کام اور اس کی ضرورت کا احساس نہیں ہوا۔ طبقہ علماء میں سے بھی کوئی 'مردِ قلندر' نہ اُٹھا جو اس ضرورت کو اپنے طور پر پورا کرتا اور نہ ہی آج تک انہیں اس کا کما حقہٗ ادراک و احساس ہی ہے۔

## عصر حاضر کی اسلامی ریاست

جنوبی ایشیا میں مسلم اقتدار کے خاتمے اور برطانوی ظالم سامراج کے پنجے گاڑ لینے سے مسلم زعما کو 'اسلامی ریاست' کی ضرورت کا احساس ہوا اور تحریک شہیدین اُٹھی۔ تاہم یہ احساس جلد ہی دب گیا۔ 1857ء کی جنگ آزادی میں استخلاص وطن اور اسلامی حکومت کی بازیافت کے لئے دوبارہ کوششیں ہوئیں مگر ہندو کی انگریز دوستی اور دوغلی پالیسی کی وجہ سے یہ کوششیں بھی ناکام ہو گئیں۔ یہ جذبہ حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ تک باقی رہا مگر ان کے جانشین کانگریس کے پلیٹ فارم پر استخلاص وطن کی جدوجہد کے میدان کی نذر ہو گئے۔

دیوبند کے قیام سے اسلامی تعلیمات کی ترویج کیلئے مدارس کا جال بچھ گیا اور قال اللہ وقال الرسول کا چرچا عام ہو گیا۔ مگر افسوس گذشتہ ڈیڑھ صدی میں فکرمند طبقہ علماء کی طرف سے 'اسلامی ریاست' کیوں؟ اور عصر حاضر میں اسلامی ریاست کے تقاضوں کی وضاحت کے لئے کوئی ایک بھی تہلکہ خیز کتاب سامنے نہ آسکی۔ شاید اس سلسلے میں سارے مسالک کے علماء میں اتفاق پایا جاتا ہے۔ (پیش نظر رہے کہ فقہ اسلامی میں سود کا خاتمہ، سٹہ، جوا اور جاگیرداری کا قلع قمع

اورعشروزکوٰۃ کے مکمل نفاذ جیسے معاملات بھی شامل ہوں گے )

اس صورت حال سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ ہمارے مدارس کے نصاب میں اس بات کی اہمیت اجاگر ہی نہیں کی جاتی۔ بلکہ قارئین اس بات کو جان کر حیران ہوں گے کہ دورِ غلامی میں ہمارے دینی مدارس کا جو نصاب مروّج تھا۔ عین وہی نصاب آج بھی نافذ العمل ہے اور برطانوی ہند میں سیاسی وعسکری طور پر برطانوی استعمار کے دفع ہوجانے، قیام پاکستان اور نعرۂ خلق خدا کے مصداق مسلمانوں کو علیحدہ وطن میسر آجانے کے باوجود طبقہ علماء کو اسلامی ریاست کی عصر حاضر میں تشکیل اور اس کے ناگزیر تقاضوں کے ضمن میں کسی کمی کا ادراک نہیں ہوسکا۔ حالانکہ حالات کا تقاضا تو یہ تھا کہ عصر حاضر میں اسلامی ریاست کا نظریہ، اس کی تشکیل، اس کے تقاضے، اس کے قیام کے لئے لائحہ عمل وغیرہ وغیرہ پر درجنوں کتابیں موجود ہوتیں پھر علمی مباحثوں کے بعد کسی ایک بات پر اکثریت کا اطمینان ہوجاتا اور اس طرح کسی سیاسی جدوجہد کے بعد اس نقطہ نظر کے مطابق اس مملکت کی تعمیر شروع ہوجاتی۔ علماء کرام اس میدان میں آگے بڑھے بھی تو انہوں نے سیاست میں حصہ لیا اور ان کی تگ ودو دائیں بازو اور بائیں بازو کی جماعتوں کے ساتھ الحاق کی صورت میں پیپلز پارٹی یا مسلم لیگ سے کچھ مراعات اور نشستوں کے حصول تک ہی محدود رہی۔

## پاکستان کی سیاست۔ انگریزی دور کا عکس

قیام پاکستان کے وقت مدون شدہ فقہ اسلامی کے فقدان اور عدم دستیابی سے جو نقصان ہوا اور انگریزی قانون ــــــــ تعزیرات پاکستان کے نام سے نافذ ہوگیا اس سے عوام کو مجموعی طور پر عدلیہ، انتظامیہ اور مقتدر طبقات (جس سے قومی اور صوبائی قیادتیں ابھرتی ہیں ) کی صورت میں STATUS QUO ملا ہے دورِ غلامی اور دورِ آزادی کا فرق سامنے نہیں آسکا۔ اسلامی حکومت کی برکات کا خواب نصف صدی تک ایک خواب ہی رہا جواب چکنا چور ہوتا جارہا ہے۔

## اُمید کی کرن

ہمارے نزدیک گذشتہ چار سال سے جاری عدلیہ انتظامیہ کشاکش میں اعلیٰ عدلیہ کا مستقبل مزاجی سے اُصولوں پر ڈٹ جانا پھر عزت مآب چیف جسٹس صاحب کی پہلے معزولی

ـــــــــ بحالی ـــــــــ برخواستگی اور دوبارہ بحالی سے اعلیٰ عدلیہ میں جو سوچ کی تبدیلی آئی ہے اور جسے عوام نہ صرف محسوس کررہے ہیں بلکہ عوام میں یہ سوچ راسخ ہوتی جارہی ہے کہ عوامی اُمنگوں کا واحد سہارا اب 'عدلیہ' ہی ہے۔

اسی صورت حال کا دوسرا رُخ یہ ہے کہ اعلیٰ عدلیہ نے گذشتہ دو سال میں بیسیوں فیصلے کئے جو انصاف کے عین مطابق تھے۔ انتظامیہ اور مقنّنہ مخلص ہوتی تو ان فیصلوں پر من وعن عمل درآمد ہوتا۔ مگر انتظامیہ اور مقنّنہ کے افراد کی ذاتی اغراض کی وجہ سے اور تنفیذ کے طریق کار کی خرابیوں کی بنا پر کسی ایک فیصلے پر بھی انتظامیہ نے عمل نہیں کیا۔ بلکہ الٹا اعلیٰ عدلیہ کے راستے میں ہر ممکن طریقہ پر رکاوٹیں کھڑی کی ہیں تاکہ انصاف کا راستہ روکا جاسکے۔

ان حالات میں ہماری اعلیٰ عدلیہ کے عزم مصمّم اور خلوص کے باوجود ملکی قانون کا ڈھانچہ اور بالخصوص ـــــــــ عدالتی طریق کار، پولیس کا نظام، تفتیش کا نظام، مجرموں کی تحویل کا نظام، جیلوں کا نظام، پولیس کی تربیت کا نظام، عدالتی عملہ کی تربیت کا نظام ـــــــــ سب کے سب نظرثانی کے متقاضی ہیں۔ نہ صرف یہ ـــــــــ بلکہ ہمارے ملک کی فوج کی تربیت اور اس کی ذہن سازی، ہمارے خفیہ اداروں کی تنظیم اور تربیت، اعلیٰ انتظامیہ کے تربیتی اداروں جیسے نیپا (NIPA) اور دیگر سروسز اکیڈمیوں کے نصاب اور طریق کار کو بھی یکسر بدلنے کی ضرورت ہے۔

تبدیلی کا یہ سارا کام 1947ء میں ہی ہو جانا چاہئے تھا مگر نہ ہو سکا۔ آج بھی ہو جائے تو غنیمت ہے۔ صبح کا بھولا شام کو بھی گھر آجائے تو بھولا ہوا نہیں کہتے۔

## فقہ اسلامی کی تنفیذ کا متوقّع موقع

ہمارے نزدیک اگلے الیکشن جب بھی ہوں اس میں 'انصاف' کے لئے تحریک کا رنگ غالب رہے گا اور ساری جماعتیں انصاف کے حق میں اپنا زور لگائیں گی۔ اہل علم اور دانشور حضرات انصاف کی عدم فراہمی پر مضامین لکھیں گے اس کی دیگر وجوہات کے ساتھ موجودہ قوانین اور عدالتی طریق کار کے نقائص کی نشاندہی کی جائے گی اور اگر خلوص ہوا (جو یقیناً ہمارے اجتماعی ضمیر سے ابھی رخصت نہیں ہوا) تو یہ ساری بحث وتمحیص اس نتیجہ تک پہنچے گی کہ انصاف کی فراہمی اور عدالتی فیصلوں کی تنفیذ کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ موجودہ قوانین اور اس سے متعلق

عدالتوں پولیس، تفتیش، مجرموں کی تحویل کا سارا نظام ہے۔ جس میں دورِ غلامی کی بو آتی ہے۔ لہٰذا ایک ملی اور قومی داعیہ پیدا ہوگا کہ ــــــــ اگر انصاف فراہم کرنا ہے تو اس نظام کو بدل دیا جائے اور اس کی جگہ اسلامی فقہ، اسلامی قوانین اور اسلامی عدالتی نظام لایا جائے۔

## مدوّن اسلامی فقہ کہاں ہے؟

مستقبل قریب میں ہمارے عدالتی نظام میں اس خلا کو پر کرنے کے لئے وہ مدوّن فقہ اسلامی کہاں ہے؟ اس سوال کا شافی جواب شاید کسی پاس نہ ہو ــــــــ کہا جاسکتا ہے کہ ہمارے آئینی تقاضے کے طور پر ــــــــ اسلامی نظریاتی کونسل موجود ہے اس نے بے تحاشہ کام کیا ہے اس سے استفادہ کیا جاسکتا ہے۔ ہمارے نزدیک اسلامی نظریہ کونسل کا کام متفقہ نہیں ہے بلکہ متنازعہ ہے۔ اولاً اس کے چیئرمین حضرات میں سے بعض ایسے بھی آئے ہیں جنہیں اسلامی قانون کی سرے سے واقفیت ہی نہیں تھی پھر ان کے لانے والوں نے اُن سے مرضی کے کام کرائے۔ مزید برآں اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارشات طبقہ علماء کے نزدیک ہمیشہ متنازعہ رہی ہیں کہ ان شفارشات پر جدیدیت، مغرب سے مرغوبیت اور اعتزال کا رنگ غالب رہا ہے۔ لہٰذا اسلامی نظریاتی کونسل کے کام سے جزوی استفادہ کیا جاسکتا ہے اور رہنمائی لی جاسکتی ہے مگر وہ نفاذ کے قابل نہیں ہے۔

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے پیروکاروں میں بھی کہیں عصر حاضر کے تقاضوں کے مطابق فقہ اسلامی کی تدوین کا کام موجود نہیں ہے۔ علماء ہیں ــــــــ مگر جذبہ اور اُمنگ (WILL) نہیں ہے کہ اُمت مسلمہ کی اس اجتماعی ملی ضرورت کو پورا کیا جاسکے۔ یہ ضرورت اگر کسی ایک مسلمان ملک میں پوری ہوجائے تو دیگر اسلامی ممالک میں بآسانی اس پر عمل درآمد ہوسکتا ہے۔ آج تو برطانیہ کینیڈا امریکہ تک سے آواز اُٹھ رہی ہے کہ کم از کم عائلی قوانین (FAMILY LAWS) تو اسلامی قانون کے مطابق کردیے جائیں۔ مگر اس فقہ اسلامی کی ایسی جامع تدوین کہ جس سے جدید ریاست کے سارے اداروں کی تطہیر ہوسکے اور ان تمام اداروں سے وابستہ افراد کی تربیت یکساں اسلامی اُصولوں کی بنیاد پر کی جاسکے تاکہ ریاست کے تمام اداروں میں ذہنی ہم آہنگی، یکسانیت اور نصب العین کی وحدت جڑ پکڑ سکے اور یوں اجتماعی سطح پر فکری و نظریاتی یکجہتی پیدا

ہو سکے جو اسلامی ریاست کے استحکام کے لئے ناگزیر ہے۔

---

ملک خداداد پاکستان کو اسلامی اُصولوں کے مطابق ڈھالنے کے لئے انقلاب کا راستہ بھی ہے کہ کوئی انقلاب آجائے اور غالباً لوگ اسی کے منتظر ہیں مگر اس سے پہلے ایک راستہ تجرباتی (HIT & TRAIL کا) بھی ہے کہ ساٹھ سال کی ٹھوکریں کھانے کے بعد جو احساس پیدا ہوا ہے اس کے تحت کچھ اصلاحات کر لی جائیں تو ملک کے عوام کو قدرے ریلیف مل سکتا ہے اور اسے ہی نرم انقلاب (SOFT REVOLUTION) کہتے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ جب نصیحت کارگر نہیں ہوتی تو عذاب آتے ہیں۔ جب مسلمانانِ پاکستان اس نرم انقلاب کے موجودہ موقع کو بھی ضائع کر دیں گے تو پھر حقیقی انقلاب کی منزل قریب ہو جائے گی اور اس کا راستہ کوئی بھی روک نہیں سکے۔ اس لئے کہ ظلم اور ناانصافی اپنی آخری حدوں کو چھو رہی ہے اب یہ صورت حال مزید زیادہ دیر قائم رہنے والی نہیں ہے۔

؎ لرزش دستک سے نہ کھلے درِ انصاف اگر
کوئی طوفان بہا دیتا ہے سجے ایوانوں کو

اللہ تعالیٰ سے دُعا ہے کہ وہ اس ملک پاکستان کے عمائدین اور دینی، مذہبی، سیاسی، انتظامی، فوجی اور فلاحی کام کرنے والی قیادت کو توفیق عطا فرمائے کہ ملکی و ملی مسائل کا صحیح ادراک کریں اور آج تک کی غلطیوں سے سبق سیکھ کر آئندہ توبہ کرتے ہوئے اصلاح احوال کے لئے کمربستہ ہو جائیں۔

اصلاح احوال کا ایک موقع ان شاءاللہ انصاف کی فراہمی کے عنوان سے آنے والے دنوں میں موضوع بحث بننے والا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں توفیق دے کہ ہم اس موقع کو امر کر سکیں اور اس سے استفادہ کر سکیں۔

؎ اُٹھ کہ اب بزم جہاں کا اور ہی انداز ہے
مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے

---

# اشراط الساعة

## 8

## نزول عیسٰی علیہ السلام

قال النبی ﷺ: اِنَّ السَّاعَةَ لَاتَقُوْمُ حَتّٰی تَکُوْنَ عَشَرَ آیَاتٍ :
.....الدُّخَان.....وَ الدَّجَّال.....وَ الدَّابَّة .....وَ طُلُوْع الشَّمْسِ مِنْ مَغْرِبِهَا وَثَلَاث خُسُوْفٍ..... خَسْفٌ بِالْمَشْرِقِ .....وَ خَسْفٌ بِالْمَغْرِبِ .....وَخَسْفٌ بِجَزِیْرَةِ الْعَرَبِ.....وَ نُزُوْل عِیْسٰی علیہ السلام .....وَ فَتْح یَاجُوْجَ وَ مَاجُوْجَ .....وَ نَار تَخْرُجُ مِنْ قَعْرِ عَدْنٍ تَسُوْقُ النَّاسَ اِلَی الْمَحْشَرِ تَبِیْتُ مَعَهُمْ حَیْثُ بَاتُوْا وَ تَقِیْلُ مَعَهُمْ حَیْثُ قَالُوْا

(مسند احمد عن حذیفة رضی اللہ عنہ)

ترجمہ: نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: قیامت قائم نہ ہوگی یہاں تک کہ دس نشانیاں ظاہر نہ ہوجائیں۔ دھواں، دجال، دابۃ الارض، مغرب سے سورج کا نکلنا، تین جگہ لوگوں کا زمین میں دھنس جانا: ایک مشرق میں، دوسرا مغرب میں اور تیسرا جزیرہ عرب میں، حضرت عیسٰی علیہ السلام کا نزول، یاجوج ماجوج کا نکلنا اور قعر عدن سے ایک آگ نکلے گی جو لوگوں کو محشر کی طرف ہانکے گی جہاں لوگ رات کو ٹھہریں گے وہاں وہ ٹھہرے گی اور جہاں دن کے وقت آرام کریں گے وہاں وہ بھی رک جائے گی۔

# نزولِ عیسیٰ علیہ السلام

انجینئر مختار فاروقی

(1) اس فرمانِ رسالت میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا دوبارہ تشریف لانا قربِ قیامت کی ایک اہم نشانی ہے۔ اُمت مسلمہ کا سوادِ اعظم آج بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اُٹھائے جانے اور دوبارہ تشریف آوری کو صحیح سمجھتا ہے البتہ تاریخ میں بعض علماء اور محققین اس سوچ کے بارے میں کچھ تحفّظات ظاہر کرتے ہیں۔ حکمت بالغہ میں علاماتِ قیامت کی تشریح کرتے ہوئے ہمارا موقف اُمت مسلمہ کے سوادِ اعظم اہل سنت کے ہی ساتھ ہے۔ لہٰذا ان سطور میں اس موقف کی روشنی میں ہی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی قربِ قیامت کے 'نشان' کے طور پر تشریف آوری کا تذکرہ ہوگا۔

(2) حسن اتفاق ہے کہ قرآن مجید میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے 'رفع' کا ذکر ہے اور ایک سے زیادہ مقامات پر آیا ہے اور حدیث پاک میں آپ علیہ السلام کی دوبارہ تشریف آوری 'نزول' کا واضح تذکرہ ہے۔ نزولِ عیسیٰ علیہ السلام کا مسئلہ آپ (علیہ السلام) کے زندہ 'رفع' کے ساتھ ہی منسلک اور مربوط ہے۔ جو اہل علم نزولِ عیسیٰ علیہ السلام کو تسلیم نہیں کرتے اور ان احادیث کے راویان پر اسماء الرجال کی بحث کر کے متن حدیث کی ثقاہت اور صحت کا انکار کرتے ہیں انہیں پھر 'رفع' والی آیات مبارکہ کے بارے میں بھی اضطراب رہتا ہے اور حقیقتاً یہ بات بڑی منطقی ہے کہ اگر نزولِ عیسیٰ علیہ السلام کا معاملہ ایک 'وہم' اور 'خیال' کی حد تک ہے اور بے بنیاد ہے تو 'رفع' چہ معنی دارد؟ اس موقع و محل پر پھر رفع آسمانی کی تاویلات شروع ہوتی ہیں اور بالآخر زندہ اُٹھائے جانے کی بھی نفی تک بات جا پہنچتی

ہے۔ پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی عام موت واقع ہونے کے دلائل لائے جاتے ہیں پھر موت ثابت ہوجائے تو ان کی 'قبر' اور 'مزار' کا معاملہ زیر بحث آتا ہے کہ وہ کہاں مدفون ہیں؛ اس لئے کہ ان کے ماننے والے بے شمار ہیں اور ان کا زمانہ بھی کوئی زمانہ ماقبل تاریخ کا نہیں ہے۔ صرف 2000 سال قبل کا زمانہ ہے۔

نزول عیسیٰ علیہ السلام کے انکار سے انسان قرآن مجید کی واضح اصطلاح 'رفع' کے عام معنی کے انکار تک جا پہنچتا ہے اور اس کے علاوہ کوئی امکان نہیں رہتا۔

(3) قرآن پاک اللہ تعالیٰ کا کلام ہے اور عربی مبین میں اُترا ہے۔ اس میں انسان کی زندگی کے مختلف مراحل کے لئے متداول الفاظ اور اصطلاحات ہی استعمال ہوئی ہیں اور ان کے معانی معروف ومشہور ہیں۔ حیات وممات کے لفظ عربی میں بڑے واضح مفہوم کے حامل ہیں جبکہ عرب محاورے میں 'رفع' کا لفظ موت کے لئے نہیں آتا اور نہ ہی قرآن پاک میں 'رفع' کے لفظ کا ترجمہ کسی تاویل کے بغیر موت سے کیا جاسکتا ہے۔ لہٰذا صاف ظاہر ہے کہ 'رفع' موت کے علاوہ کسی اور حقیقت کے لئے بولا گیا ہے اور چونکہ یہ الفاظ ایک 'نادرالوقوع' بلکہ ایسے واقعے کے لئے بولا گیا ہے جس کی کوئی دوسری مثال تاریخ انسانی میں ہے ہی نہیں ——— لہٰذا اس کے مفہوم کی حفاظت خود قرآن مجید کے اُتارنے والے اللہ تعالیٰ کے ہی ذمہ ہے اور اس کی وضاحت شارح قرآن کی حیثیت سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذمہ داری یا فرض منصبی ہے جن پر یہ قرآن پاک اُتارا گیا ہے۔ چنانچہ ——— جیسا کہ اوپر مذکور ہوا ہے قرآن پاک میں 'رفع عیسیٰ علیہ السلام' کا تذکرہ ہے تو حدیث میں 'نزولِ عیسیٰ علیہ السلام' کے الفاظ وارد ہیں جو ایک ہی حقیقت کے دو رُخ ہیں یا ایک ہی استدلال کی دو کڑیاں یا ایک ہی قضیئے کا صُغریٰ اور کُبریٰ۔

(4) نزول عیسیٰ علیہ السلام یعنی آپ علیہ السلام کی دوبارہ تشریف آوری کے معاملے کو ایک اور پہلو سے بھی سامنے رکھنے کی ضرورت ہے اور یہ پہلو چونکہ قرآنِ پاک میں بیان ہوا ہے لہٰذا نہایت اہم ہے۔ یہ معاملہ ذرا تفصیل طلب ہے اور اس کی تفصیل یہ ہے:

(الف) قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی رہنمائی کے لئے انسانوں میں سے ہی نبی معبوث فرمائے اور رسول بھیجے انہیں ہدایت دی وحی سے سرفراز فرمایا اور انسانیت کی رہنمائی کا

فریضہ سونپ دیا۔

'نبی اور 'رسول' دو الفاظ اللہ تعالیٰ کے اُن برگزیدہ بندوں کے لئے استعمال ہوئے ہیں جنہیں ذاتِ باری تعالیٰ نے وحی اور ہدایت سے سرفراز فرمایا۔ نبی اور رسول کے الفاظ میں عام اور خاص کا تعلق ہے جبکہ ذمہ داری یعنی فرائض منصبی ایک جیسے ہی تھے۔

مشہور روایت کے مطابق اللہ تعالیٰ نے کل ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء علیہم السلام مبعوث فرمائے۔ جن میں سے چن کر (اصطفاء) 313 نفوس کو رسول بنا دیا۔ نبی اور رسول کے دو الفاظ ہیں تو ان کے مفہوم اور مدّعا میں بھی فرق ہے۔ کسی زبان کے کوئی دو الفاظ صد فی صد مشابہ نہیں ہوتے کسی پہلو سے کوئی نہ کوئی وجہ امتیاز ہوتی ہے جس کی وجہ سے دوسرا لفظ تخلیق کرنا پڑتا ہے عربی میں تلوار، شیر اور گھوڑے کے لئے درجنوں الفاظ کا اہل زبان میں رائج ہونا اسی بات کا مظہر ہے۔

(ب) 'نبی' اور 'رسول' کے الفاظ قرآن پاک میں کئی جگہ استعمال ہوئے ہیں۔ النَّبی کا لفظ 43 مرتبہ آیا ہے جبکہ رسولٌ کا لفظ 116 مرتبہ آیا ہے۔ پھر قرآن پاک نے ان الفاظ میں فرق کو بھی واضح فرمایا ہے۔ ایک فرق جو عام طور پر بیان ہوتا ہے کہ نبی اور رسول کے الفاظ میں عام اور خاص کی نسبت ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر نبی تو لازماً رسول نہیں تھا مگر ہر رسول یقیناً نبی بھی تھا۔ قرآن پاک کی فصاحت و بلاغت کے کیا کہنے، قاری کے سامنے ایک بات رکھ دیتا ہے تاکہ صاحب فہم اس کا منطقی نتیجہ خود اخذ کر لے۔ قرآن پاک میں ختم نبوت کا ذکر صراحتاً آیا ہے کہ آپ ﷺ آخری نبی ہیں گویا جب ختم نبوت ہوگئی تو منطقی طور پر رسالت کا باب بھی بند ہوگیا۔ آپ خاتم النّبیین تو ہیں ہی ـــــ بلاشک وشبہ خاتم المرسلین بھی ہیں۔ فداہ آباؤنا و امہاتنا

(ج) قرآن پاک میں ایک اور فرق ـــــ نبی اور رسول کے مابین بڑی صراحت سے آیا ہے۔ صہیونیت کے جرائم کا ذکر قرآن پاک میں ہے چنانچہ جرائم کی فہرست میں ایک اہم اور گھناؤنا جرم 'قتل انبیاء' کا بھی ہے۔ چنانچہ یہ بات قرآن پاک میں لِمَ تَقْتُلُوْنَ اَنْبِیَاءَ اللّٰہِ (02-91)، یَقْتُلُوْنَ النَّبِیّٖنَ (02-61 اور 03-21)، یَقْتُلُوْنَ الْاَنْبِیَاءَ (03-212) اور لِمَ قتلتموھم (03-183) وغیرہ الفاظ میں بیان ہوئی ہے کہ وہ (یہود) نبیوں کو بلا جواز قتل دیتے تھے۔

جرم اپنی جگہ، مگر انبیاء علیہم السلام قتل ہو گئے اس کے برعکس رسول علیہم السلام کا قتل ہونا تو دور

کی بات ہے کبھی دشمن کے ہاتھ بھی نہیں آئے بلکہ رسول ہمیشہ اپنے مخالفین پر غالب رہے

كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَ رُسُلِیْ (58-21)

''اللہ نے طے کر رکھا ہے کہ میں (خود) اور میرے رسول ہمیشہ غالب رہے گے''

(د) حضرت نوح علیہ السلام حضرت ھود علیہ السلام حضرت صالح علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے رسول تھے، قوم نے اگر چہ ان کی مخالفت کی اور ستایا تاہم ایک مدت کے بعد اللہ تعالیٰ نے اپنے برگزیدہ رسولوں اور ان پر ایمان لانیوالوں کو بچالیا اور رسولوں کے انکار پر ان رسولوں علیہم السلام کے سامنے ان کی قوموں پر عذاب آ گیا اور قومیں نیست و نابود کر دی گئیں۔ اس کو عذاب استیصال کہا جاتا ہے کہ رسولوں کے انکار کی صورت میں قوموں کو جڑ سے اکھیڑ دینے والا اور بیج ختم کر دینے والا عذاب آ گیا۔

اسی مقدس گروہ کے ایک فرد حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں۔ تیسرے پارے کے آغاز میں رسولوں کی مقدس جماعت کا ذکر ہے اور اس میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا بطور خاص ذکر آیا ہے۔

(ہ) بنی اسرائیل کی تاریخ میں ہزاروں نبی قتل ہو گئے خود عہد نامہ قدیم اس پر گواہ ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو یہود نے کوئی وقعت نہ دی حالانکہ وہ ان کی اپنی قوم اور برادری میں سے تھے انہیں کی زبان بولتے ہوئے آئے تھے اور ان کی بشارتیں بھی سابقہ کتب میں موجود تھیں ان کے والدہ پر الزام تراشی کی، برنباس کی انجیل کے مطابق ان کو واجب القتل قرار دے کر رومیوں کے حوالہ کر دیا تا کہ ان کو سزائے موت دے دی جائے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام رسول تھے بنی اسرائیل ہی کی طرف قرآن پاک میں ان کا ذکر نہایت پر شکوہ اور شاندار الفاظ میں آیا ہے۔ چنانچہ سورۂ آل عمران میں آپ (علیہ السلام) کی والدہ محترمہ حضرت مریم سلام علیہا کو فرشتوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں قبل از ولادت ہی ان الفاظ میں بشارت دی ہے

اِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ اسْمُهُ الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ وَجِيْهًا فِى الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ وَ مِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ O وَ يُكَلِّمُ النَّاسَ فِى الْمَهْدِ وَ كَهْلًا وَّ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ O قَالَتْ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِىْ

وَلَدٌ وَّ لَمۡ یَمۡسَسۡنِیۡ بَشَرٌ قَالَ کَذٰلِكِ اللّٰهُ یَخۡلُقُ مَایَشَآءُ اِذَا قَضٰۤی اَمۡرًا فَاِنَّمَا یَقُوۡلُ لَهٗ کُنۡ فَیَکُوۡنُO وَ یُعَلِّمُهُ الۡکِتٰبَ وَ الۡحِکۡمَةَ وَ التَّوۡرٰةَ وَ الۡاِنۡجِیۡلَ O وَ رَسُوۡلًا اِلٰی بَنِیۡۤ اِسۡرَآئِیۡلَ اَنِّیۡ قَدۡ جِئۡتُکُمۡ بِاٰیَةٍ مِّنۡ رَّبِّکُمۡ اَنِّیۡۤ اَخۡلُقُ لَکُمۡ مِنَ الطِّیۡنِ کَهَیۡئَةِ الطَّیۡرِ فَاَنۡفُخُ فِیۡهِ فَیَکُوۡنُ طَیۡرًا بِاِذۡنِ اللّٰهِ وَ اُبۡرِئُ الۡاَکۡمَهَ وَ الۡاَبۡرَصَ وَ اُحۡیِ الۡمَوۡتٰی بِاِذۡنِ اللّٰهِ وَ اُنَبِّئُکُمۡ بِمَا تَاۡکُلُوۡنَ وَ مَا تَدَّخِرُوۡنَ فِیۡ بُیُوۡتِکُمۡ اِنَّ فِیۡ ذٰلِكَ لَاٰیَةً لَّکُمۡ اِنۡ کُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِیۡنَO (49-45:03)

''(وہ وقت بھی یاد کرنے کے لائق ہے) جب فرشتوں نے (مریم سے کہا) کہ مریم! اللہ تم کو اپنی طرف سے ایک فیض کی بشارت دیتا ہے جس کا نام مسیح عیسیٰ ابن مریم ہوگا (اور جو) دنیا اور آخرت میں باآبرو اور (اللہ کے) خاصوں میں سے ہوگا۔ اور ماں کی گود میں اور بڑی عمر کا ہوکر (دونوں حالتوں میں) لوگوں سے (یکساں) گفتگو کرے گا اور نیکوکاروں میں ہوگا۔ مریم نے کہا: پروردگار! میرے ہاں بچہ کیونکر ہوگا کہ کسی انسان نے مجھے ہاتھ تک تو لگایا نہیں۔ فرمایا کہ اللہ اسی طرح جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے۔ جب وہ کوئی کام کرنا چاہتا ہے تو ارشاد فرد یتا ہے کہ ہوجا' تو وہ ہوجاتا ہے۔ اور وہ انہیں لکھنا (پڑھنا) اور دانائی اور تورات اور انجیل سکھائے گا۔ اور (عیسیٰ) بنی اسرائیل کی طرف پیغمبر (ہوکر جائیں گے اور کہیں گے) کہ میں تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی طرف سے نشانی لے کر آیا ہوں وہ یہ کہ تمہارے سامنے مٹی کی مورت بشکل پرندہ بناتا ہوں پھر اس میں پھونک مارتا ہوں تو وہ اللہ کے حکم سے (سچ مچ) پرندہ ہوجاتا ہے اور اندھے اور ابرص کو تندرست کر دیتا ہوں اور اللہ کے حکم سے مردے میں جان ڈال دیتا ہوں اور جو کچھ تم کھا کر آتے ہو اور جو اپنے گھروں میں جمع کر رکھتے ہو سب تم کو بتا دیتا ہوں اگر تم صاحب ایمان ہو تو ان باتوں میں تمہارے لیے (اللہ کے قدرت کی) نشانی ہے۔''

ایسے شان والے رسول علیہ السلام کے خلاف سازش کر کے سولی پر لٹکانے کے حالات پیدا کر دینا بالارادہ منصوبہ بندی کا مظہر ہے اور اپنے وقت کے رسول علیہ السلام کے ساتھ یہ سلوک کفر اور تکذیب کی بدترین اور گھناؤنی شکل ہے نیز شقاوت قلبی کا آخری درجہ بھی۔

(و) حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ یہود کے اس رویے کے غلط ہونے میں کوئی شک نہیں ہے اس قوم پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے عذاب استیصال آنا چاہئے تھا صہیونیت کا یہ ابتدائی طبقہ اس عذاب کا صد فی صد مستحق بھی تھا مگر ہم تاریخ عالم میں دیکھتے ہیں کہ اس گروہ کو سوائے جلاوطنی (70ء) کے کوئی سزا نہیں ہوئی فوری عذاب میں تخفیف اور عذاب استیصال کا التواء غالباً اس وجہ سے ہو کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اس عذاب کے وقت قوم میں موجود نہیں تھے اس جلاوطنی کے دوران اپنے دورِ انتشار میں صہیونیت کی ایک شاخ جو منصوبہ بندی کے ساتھ مدینہ (جزیرۃ العرب) میں جا کر آباد ہوئی تھی وہ آسمانی ہدایت کے لانے والے آخری پیغمبر حضرت محمد ﷺ کو پہچاننے کے باوجود ان سے گتھم گتھا نظر آتی ہے، قتل کے منصوبے بناتی ہے اور آپ ﷺ کو ناکام کرنے کے لئے ہر ممکن سازش، ہر ممکن ہتھکنڈا اور ہر ممکن راستہ استعمال کرتے نظر آتی ہے۔

(ذ) حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے انکار اور صلیب دینے کے گھناؤنے منصوبے پر اس قوم (صہیونیت کے علمبردار گروہ اور ان کے حامیان و پشتیبانان) پر عذاب خداوندی کا فیصلہ صادر ہو گیا۔ تاہم عام حالات میں بھی کسی سزائے موت کے قیدی کی سزائے موت بعض ناگزیر اُمور اور تقاضوں کی وجہ سے تاحکم ثانی موخر کر دی جاتی ہے اس طرح اس قوم بنی اسرائیل پر عذاب استیصال کو پہلے رسول اللہ ﷺ کی تشریف آوری تک ازراہِ ترحم موخر کیا گیا (جیسا کہ سورۂ بنی اسرائیل کے پہلے رکوع میں تذکرہ ہے) مگر اس موقع سے بھی فائدہ نہ اُٹھانے اور سابقہ بدعہدی و دین دشمنی، خدابیزاری، خدادشمنی کے ساتھ رسولوں، وحی اور آسمانی ہدایت سے دشمنی یعنی سیکولرازم کے پرچارک بننے کی وجہ سے عذاب الٰہی کی توثیق تو ہو گئی ـــــــ مگر اس پر عمل درآمد موخر کر دیا گیا ـــــــ یہ حکمت خداوندی ہے اور فعل الحکیم لایخلو عن الحکمة ـــــــ جبکہ خالق ارض وسماء تو ہے ہی 'الحکیم'۔

(ح) صہیونیت کے پرستاروں پر عذاب استیصال کے موخر ہونے کی ایک حکمت جو اظہر من

الشّمس ہے وہ ہم یہاں تذکرہ کررہے ہیں۔ہم سے بڑے اہل علم ودانش ممکن ہے چنداور حکمتیں بھی سامنے لے آئیں تاہم حتمی بات یہی ہے کہ ان اُمور کا کما حقہٗ جاننے والا اور سب حکمتوں کا احاطہ کرنے والاصرف ٗاللہ ٗہی ہے۔واللہ اعلم

(ط) صہیونیت کی ابتداء بڑی معصوم سی صورت میں برادرانِ یوسف علیہ السلام کے رویے سے ہوئی جو پروان چڑھتی رہی اور فرعون کی غلامی کے دوران تنظیم بنی۔۔۔۔۔۔ضرت موسیٰ علیہ السلام کے دورِمبارک میں مزید مستحکم ہوئی۔۔۔۔۔ حضرت داؤد علیہ السلام اور سلیمان علیہ السلام کے دور میں بالغ ہوگئی بابل کی اسیری کے دوران اس میں مزید کئی جہتوں سے مضبوطی آئی۔۔۔۔۔ آسمانی ہدایت سے فرار اس کی بنیاد بن گئی جو بڑھ کر خدا بیزاری اور خدا دشمنی تک جا پہنچی (اسی بات کو آج کل وحی ونبوت کے انکار کی وجہ سے سیکولرازم کہا جاتا ہے )اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ نبی اسرائیل میں مبعوث ہونیوالے پیغمبروں کا مذاق،استہزاء اورانکار شروع ہوا بات ڈھٹائی تک جا پہنچی اور علی الاعلان اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولوں کے احکام کی صریح خلاف ورزی بھی ہونے لگی۔قتل انبیاء کرام (علیہم السلام) کا گھناؤنا جرم سرزد ہوااوراس پر کوئی شرمندگی محسوس نہیں کی گئی بلکہ اس میں اضافہ ہوتا گیااور بے شمار انبیاء کرام علیہم السلام قتل ہوگئے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے چھ صدیاں پہلے کا عرصہ تاریخ انسانی میں مشرق وسطی کے علاقے میں قتل انبیاء کے جرم کی وجہ سے سیاہ ترین دور ہے۔

(ی) صہیونیت (قوم یہود) کی ان کاروائیوں سے مقصود یہ تھا کہ آسمانی ہدایت موجود ہوتو بے عملی کی صورت میں علماء وعوام ٹوکتے ہیں۔اس ہدایت کو غائب کردیا جائے اوراس سلسلہ کو ختم کردیا جائے تو انہیں من مانی کرنے سے کوئی روکنے والا نہیں ہوگا۔چنانچہ پہلے تورات غائب ہوئی اور آسمانی ہدایت جو تحریری شکل میں حفاظت کی غرض سے اُتری تھی وہ نہ رہی پھر بھی انبیاء کرام علیہم السلام کا سلسلہ جاری رہا تو انبیاء کرام علیہم السلام کو بھی قتل کرنے کا عمل شروع ہوا۔قرآن پاک میں ارشاد باری تعالیٰ ہے

لَقَدۡ اَخَذۡنَا مِیۡثَاقَ بَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ وَ اَرۡسَلۡنَاۤ اِلَیۡہِمۡ رُسُلًا ؕ کُلَّمَا جَآءَہُمۡ رَسُوۡلٌۢ بِمَا لَا تَہۡوٰۤی اَنۡفُسُہُمۡ ۙ فَرِیۡقًا کَذَّبُوۡا وَ فَرِیۡقًا یَّقۡتُلُوۡنَ ٭ وَ حَسِبُوۡۤا اَلَّا تَکُوۡنَ فِتۡنَۃٌ فَعَمُوۡا وَ صَمُّوۡا ثُمَّ تَابَ اللّٰہُ عَلَیۡہِمۡ ثُمَّ عَمُوۡا وَ صَمُّوۡا کَثِیۡرًا مِّنۡہُمۡ ؕ وَ اللّٰہُ بَصِیۡرٌۢ بِمَا یَعۡمَلُوۡنَ (05:70-71)

''ہم نے بنی اسرئیل سے عہد بھی لیا اور ان کی طرف پیغمبر بھی بھیجے (لیکن) جب کوئی پیغمبر ان کے پاس ایسی باتیں لے کر آتا جن کو ان کے دل نہیں چاہتے تھے تو (پہلے) وہ (انبیاء کی) ایک جماعت کو تو جھٹلا رہے اور (بعد ازاں) ایک جماعت کو قتل کر دیتے تھے۔ اور یہ خیال کرتے تھے کہ (اس سے ان پر) کوئی آفت نہیں آنے کی، تو وہ اندھے اور بہرے ہو گئے پھر اللہ تعالیٰ نے ان پر مہربانی فرمائی (لیکن) پھر ان میں سے بہت سے اندھے اور بہرے ہو گئے اور اللہ ان کے سب کاموں کو دیکھ رہا ہے۔''

(ک) قتل انبیاء علیہم السلام کے جرم میں بے باکی اور جری ہونے کی وجہ سے ہی یہود نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر (جو کہ مقام رسالت کے رفیع درجے پر فائز تھے) اثر انداز ہونے کی کوشش کی اور زبردست منصوبہ بندی سے ان کو ختم کرنے کی ناپاک کوشش کی۔

(ل) اسی سلسلے میں پہلے سے منصوبہ بندی کر کے وہ حضرت محمد ﷺ کا راستہ روکنے کے لئے مدینہ میں آباد تھے اور مختلف ہتھکنڈوں سے آپ ﷺ کو پریشان کیا، بے آرام کیا، جنگوں کا بازار گرم کیا۔ مگر رسالت کاملہ کے مقابلے میں منہ کی کھائی، قتل ہوئے، جلاوطن ہوئے، خوار ہوئے مگر ــــــــ توبہ نہ کی۔

(م) حضرت محمد ﷺ نے انہیں پہلے خیبر اور پھر مدینہ کے شمال مشرق کے علاقہ جات میں دھکیل دیا اور حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

لَأُخْرِجَنَّ الْيَهُوْدَ وَ النَّصَارٰى مِنْ جَزِيْرَةِ الْعَرَبِ..... (مسلم)

''میں یہود و نصاریٰ کو جزیرۂ عرب سے نکال دوں گا.....''

آپ ﷺ کے اس فرمان پر عمل درآمد کا موقع حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں آیا۔ اور جزیرۃ العرب سے نکال دیے گئے۔ آپ پر ختم نبوت کا اعلان ہوا ــــــــ تو اس شیطانی گروہ کو دوبارہ منظم ہونے اور گل کھلانے کے امکانات نظر آئے اور ان کی جان میں جان آ گئی۔

(ن) حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے قبل چھ صدیاں قتل انبیاء علیہم السلام کا جرم، پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا معاملہ، بعد ازاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت محمد ﷺ کے مابین چھ صدیوں (33ء سے 613ء)

کا 'فترۃ وحی' کا عرصہ ــــــــــ اس گروہ کے لئے شیطانی منصوبے بنانے اور سازشوں کا جال پھیلانے کا دور ہے۔

(س) اس گروہ کی چالیں اتنی باریک، عزائم اتنے خوفناک اور انسان دشمن مقاصد کے حصول کے لئے منصوبہ بندی (PLANNING) اتنی ماہرانہ ہوتی رہی کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ پھر ان کو بارہ صدیاں آسمانی ہدایت کے خلا کی وجہ سے گل کھلانے کا موقع خوب مل گیا۔ شیطان کے آلہ کار بنے اور شیطان نے انہیں اوّلاً گمراہ کیا اور بعد میں دوسرے انسانوں کو گمراہ کرنے کے لئے خوب خوب استعمال کیا۔

(ع) حضرت محمد ﷺ کے ہاتھوں جلاوطن ہونے کے موقع پر ہی ــــــــــ ختم نبوت کا اعلان ہوا تو اُنہوں نے کئی خوفناک منصوبے مزید سوچ لئے۔ پہلے انسانوں کو ہدایت سے محروم کرنے کے لئے قتل انبیاء علیہم السلام کا جرم تھا اب ختم نبوت کے بعد ــــــــــ لوگوں کو مذہب کے نام پر ہی گمراہ کرنے کے لئے جھوٹے مدعیان نبوت کا قضیہ کھڑا کر دیا گیا اور آپ ﷺ کی حیات طیبہ میں ہی جھوٹے نبی سامنے آ گئے اور بعد میں بھی یہ سلسلہ جاری رہا۔

(ف) صہیونیت کے علمبردار، قتل انبیاء علیہم السلام کے عادی اس گروہ کی منصوبہ بندی اتنی خفیہ اور شاطرانہ رہی کہ تاریخ انسانی کی ساری خفیہ تنظیموں کا سلسلہ بالآخر اسی شیطانی گروہ سے جا ملتا ہے قرآن پاک میں ان کے جرائم کا پہلے پارہ کے دس رکوعوں میں ذکر ہے مگر مسلمان ہی توجہ نہیں کرتے تو باقی دنیا ان سے کیسے واقفیت حاصل کر سکتی ہے۔ پھر آپ ﷺ کو جس طرح اُنہوں نے ستایا اور بے آرام کیا اور جنگیں مسلط کیں وہ پس منظر بھی پوری طرح لوگوں کے سامنے نہیں تھا اس کا اندازہ صرف آپ ﷺ کو ہی تھا۔ مزید برآں ــــــــــ ختم نبوت کے اعلان کے بعد اس گروہ نے جو شیطانی منصوبے بنائے وہ ابھی پردہ راز میں ہی تھے تاہم اللہ تعالیٰ کے علم تھے۔ ان کے مزعومہ شیطانی مقاصد ان کو بے چین کیے ہوئے تھے اور آسمانی ہدایت کو غائب کر کے وہ خدا بیزار اور دین دشمن حیوانی سطح کا معاشرہ قائم کرنے کے خواب دیکھ رہے تھے (ایسے معاشرے کو ہی آج کل سیکولر معاشرہ کہتے ہیں)

(ص) اللہ تعالیٰ اس گروہ کو آپ ﷺ کے کفر و انکار و تکذیب کی پاداش میں عذاب استیصال

کے ذریعے نیست و نابود کر دیتا تو شاید دنیا کے بہت سے لوگ جو ان کے حقیقی جرائم سے لاعلم تھے ان کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کرتے نظر آتے۔

اللہ تعالیٰ نے یہود کے خفیہ عزائم کو آشکارا کرنے، اُن کی خدا بیزاری اور مذہب دشمنی کو طشت از بام کرنے، ان کی شیطانی مکارانہ چالوں اور منصوبوں کو سامنے لانے کے لئے ـــــ نیز اُمت مسلمہ کے حریف کے طور پر 'حزب الشیطان' کی حیثیت سے مہلت دی ہے۔ اس کا ذکر قرآن پاک میں سورۃ الرحمٰن میں وارد ہوا ہے۔ پس منظر میں یہود و منافقین کی سازشیں، آپ ﷺ کے قتل کے منصوبے، جنگ بدر، احد اور خندق میں خفیہ رابطے اور دشمن فوجوں کو ہر طرح کی مدد دینے کا وعدہ اور سابقہ قتل انبیاء علیہم السلام کا جرم رہے تو یہ بات زیادہ حقیقی نظر آئے گی۔ ارشاد ہے

سَنَفْرُغُ لَكُمْ اَيُّهَ الثَّقَلٰنِ O فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ O يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَ الْاِنْسِ اِنِ اسْتَطَعْتُمْ اَنْ تَنْفُذُوْ مِنْ اَقْطَارِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ فَانْفُذُوْا لَا تَنْفُذُوْنَ اِلَّا بِسُلْطٰنٍ O

''اب عنقریب (آسمانی ہدایت کو کتب سماویہ کے انزال کے عمل سے فارغ ہو کر اور ختم نبوت کا اعلان فرما کر) ہم اے جنوں اور انسانوں (کے خبیث گروہ) تمہارے لئے فارغ ہوا چاہتے ہیں۔ تو اے جنو! اور انسانو! تم اپنے رب کی کون کون سی قدرت کا انکار کرو گے۔ اے گروہ جن و انس (صہیونیت کے پرستارو) اب تم اپنی منصوبہ بندی سے اللہ کی پکڑ سے بچنے کے لئے آسمان و زمین کے کناروں سے نکل کر بھاگ سکتے ہو تو بھاگ جاؤ مگر (ہم ہی جواز اور سند نہ دیں تو) تم کہیں بچ کر جا ہی نہیں سکتے۔ (اس لئے کہ اب تمہارا آخری وقت قریب آ رہا ہے)''

آپ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے

بعثت انا و الساعة كهاتين و يقرن بين اصبعيه السبابة و الوسطى

''آپ ﷺ نے اپنی شہادت کی انگلی اور درمیان والی انگلی کو ملاتے ہوئے فرمایا کہ مجھے مبعوث کیا گیا کہ میں اور قیامت اس طرح ہیں'' (مسلم)

گویا صہیونیت کا یہ انجام اسی دور میں ہونے والا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں تقریباً چودہ

صدیاں مہلت دی ہے اور اس عرصہ میں اس گروہ نے آگے بڑھتے بڑھتے بالخصوص گزشتہ چھ صدیوں میں ابلیسی ہتھکنڈوں سے لیس ہوکر اور سائنسی ترقی اور وسائل کو غلط استعمال کر کے وہ درجہ حاصل کرلیا ہے جو عام اقوام کی سوچ سے بھی بالاتر ہے۔

(ق) ہمارے نزدیک اس گروہ کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے انکار پر ہی عذاب استیصال کا سزوار قرار دیا جاچکا تھا پھر آپ ﷺ کے انکار پر یہ عذاب مؤکد ہوکر اور شدید ہوگیا اور یہ عذاب استیصال متعلقہ پیغمبر کی نگاہوں کے سامنے ہونا ضروری ہے (یہی سنت اللہ ہے)۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام 'رفع' کی صورت میں کہیں حیات بھی ہیں تو اس موقع پر ان کا تشریف لانا اور صہیونیت نے جوان ہوکر جودجالیت کا روپ دھارلیا ہے اس کا قلع قمع کرنا قرین قیاس ہے۔

اس پس منظر میں قرآن مجید کے الفاظ کہ ''وہ بچپن میں بھی معجزانہ طور پر باتیں کریں گے (وہ تو ہو چکا) اور پختہ عمر میں بھی باتیں کریں گے'' یہ اب نزول عیسیٰ علیہ السلام کے بعد ہی ممکن ہونے والا ہے۔ واللہ اعلم

(ر) صہیونیت کے پرستاروں (یہود) نے آج جیسا کہ ہمارے سامنے ہے، بے پناہ وسائل حاصل کر لئے ہیں ساری سائنسی ترقی اور ایجادات پر اُن کا قبضہ ہے جنگی سامان اور آلات حرب وضرب ان کی دسترس میں ہے پھر میڈیا اخبارات ٹی وی اُن کے پاس ہے بے حیائی کے وسائل بھی ان کی دسترس میں ہیں جس کی وجہ دنیا بھر کے منچلے عوام اُن کے ہم نوا ہیں۔ اس صہیونیت کا ایک بڑا لیڈر بھی سامنے آنے والا ہے جو اہل ایمان کے نزدیک دجال ہوگا۔

(ش) یہودیوں نے چونکہ تورات کی پیش گوئیوں کے باوجود حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو تسلیم نہیں کیا اور اُن پر ایمان نہیں لائے تھے اور انہیں 'معاذ اللہ' جھوٹا قرار دیا تھا لہٰذا اس شیطانی طبقہ کے نزدیک تورات کی پیش گوئیوں کا مصداق حضرت مسیح علیہ السلام ابھی آنے والے ہیں۔ اس لیے قرین قیاس ہے کہ یہود کا لیڈر جو دجال کہلائے گا وہ دعویٰ نبوت کرے گا اور مسیح ہونے کا مدعی بھی ہوگا۔

(ت) اس شخص کو جو دجال (بہت بڑا دھوکے باز) ہوگا اور مسیح ہونے کا دعویٰ کرے گا ــــــــ عام مسلمانوں میں بالخصوص نزول عیسیٰ علیہ السلام کے قائل طبقہ میں یہ شخص مسیح الدجال کے نام سے یاد کیا جاتا ہے یعنی جھوٹا یا بناوٹی مسیح۔

(ث) ایسے ہی موقع پر (جواب قریب ہے) مشرق وسطی میں مسلمان اس دجال سے حالت جنگ میں ہوں گے کہ حضرت مسیح علیہ السلام تشریف لائیں گے اور مسلمان فوجوں کی قیادت کرتے ہوئے مسیح الدجال کو (ترمذی شریف کی روایت کے مطابق) 'لُد' کے دروازے کے پاس قتل کردیں گے۔

یادرہے کہ لُد (LYDA) اسرائیل کا ایک شہر ہے اور فضائی فوج کا بہت بڑا اڈہ (AIR BASE) ہے۔احادیث میں وارد ہے کہ اس موقع پر ایک ایک یہودی قتل ہوجائے گا۔ یہی عذاب استیصال ہوگا کہ قوم یہود کا نام ونشان ہی مٹ جائے گا۔

(5) حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تشریف آوری پر مقابلے کے لئے جو گروہ بندی ہوگی اس میں اہل ایمان حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ ہوں گے جبکہ المسیح الدجال کے ساتھ یہود اور ان کے دیگر زیر اثر وہم خیال گروپ ہوں گے وہ سب کے سب مٹ جائیں گے۔

(6) اس طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تشریف آوری سے دنیا اس سازشی ٹولہ کی تین ہزار سالہ فتنہ پرور سازشوں اور اس دین دشمن، انسان دشمن، اور اخلاق دشمن ابلیسی گروہ سے پاک ہوجائے گی اہل علم جانتے ہیں کہ آج صہیونیت کے علمبردار جس قدر موثر ہیں اور پھیلے ہوئے ہیں اور ہر خیر کے کام اور عدل وانصاف میں رکاوٹ ہیں نیز آسمانی ہدایت کے دشمن ہیں اُن کے خاتمے کے بعد ہی ــــــــ روئے ارضی پر عدل وانصاف اور اخلاق پر مبنی آسمانی بادشاہت یا نظام مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم یا خلافت علی منہاج النبوۃ کا قیام ممکن ہوسکے گا۔

(7) اللہ تعالیٰ سے ہماری عاجزانہ دُعا ہے کہ وہ صہیونیت کے اس عالمی غلبہ کو ختم کرنے کے لئے ہمیں بھی ہمت اور حوصلہ دے اور ایسے حالات جلدی پیدا فرمادے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تشریف پر یہ گروہ اپنے انجام کو پہنچ جائے تاکہ نوع انسانی اس ابلیسی گروہ کی انسان دشمن اور اخلاق دشمن سیکولر اور لبرل سوچ سے گلوخلاصی حاصل کرکے معرفت الٰہی کے قریب ہوسکے۔

مزید برآں دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں دجال کی چالووں سے بچائے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ ہوکر المسیح الدجال کا مقابلہ کرنے کا موقع بخشے آمین۔

# خودی اور آرٹ کی روشنی

## تاج محل اور وسطی ہند کے بدنامِ زمانہ مندر

انسانی نظریات ہی اس کے اعمال کو ایک خاص رخ عطا کرتے ہیں اور انفرادی و اجتماعی تخلیقی عمل (CREATIVE ACTIVITIES) کسی معاشرہ کے نظریات ہی کے تابع ہوتے ہیں۔ اس شمارے میں ڈاکٹر رفیع الدین مرحوم کی کتاب 'حکمت اقبال' سے خودی اور آرٹ کے موضوع پر ایک حصہ شامل اشاعت ہے۔ خودی بلند ہو تو نگاہ پاک ہوگی، روح عفیف ہوگی، نظریات صالح ہوں گے، تخلیقی عمل میں تعمیرات، کھیل کود، مشغلے اور دیگر فنون بھی اسی رخ پر ہوں گے۔

پاکستان کے قیام کے وقت 'دوقومی نظریہ' کی بحث چلی تھی جو آج بڑھ کر عالمی سطح تک پھیل گئی ہے۔ ہندو ذہن اور اس کے نظریات اس کے فن تعمیر سے ظاہر ہیں جبکہ مسلم ذہن اور اس کے نظریات مسلمانوں کی تعمیرات سے ظاہر ہیں۔

ہند میں ہندو راج 800ء تک عروج پر رہا اور اس دور میں دیگر عمارتوں کے علاوہ پورے ہند میں بے شمار مندر تعمیر ہوئے بالخصوص وسطی ہند کے مندر۔ جن میں فحاشی اور عریانی کو مجسم شکلوں میں سجا کر مندروں کی تعمیر کی گئی ہے۔ یہ ان کی مذہبی عمارات ہیں۔ جبکہ.....دوسری طرف مسلم تعمیرات میں ایک بادشاہ شاہجہاں نے اپنی ایک محبوب بیوی کی یادگار تاج محل تعمیر کر دی۔ مگر اس تعمیر میں عفت و عصمت، پاکیزگی کا رنگ نمایاں ہے شاہ جہاں اور اس کی بیگم کا کوئی بے لباس تو کیا ملبوس مجسمہ بھی نصب نہیں کیا گیا۔

آگے مضمون میں ہندوؤں کی مذہبی عبادت گاہوں اور مسلمانوں کی محبت کی نشانی کا تقابل کر کے ہندو اور مسلم نظریات کی صحت اور پاکیزگی کا تقابل کیا گیا ہے۔ یہی نظریات کا فرق ہی 'دوقومی نظریہ' کی بنیاد ہے۔

(ادارہ)

# دوقومی نظریہ کا فروغ

## تاج محل اور وسطی ہند کے بدنام زمانہ مندر

### ہندو اور مسلمان تہذیب کے عبادت اور محبت کے نشان آمنے سامنے

انجینئر مختار فاروقی

تاریخ انسانی شاہد ہے کہ جب کسی علاقے میں کوئی قوم یا اجتماعیت سیاسی اقتدار حاصل کر کے علاقے میں مستحکم حکومت قائم کرنے میں کامیاب ہوئی ہے تو اُس نے اپنے وسائل سے اپنے نظریات کی روشنی میں سابقہ اقدار و روایات سے ہٹ کر 'نئی دنیا' تعمیر کرنے کی کوشش کی ہے یہ اُس کا حق بھی ہوتا ہے اور اس طرح طرزِ تعمیر، طرزِ بود و باش، آرائش و زیبائش کے طریقے، باغات، شہر، عبادت گاہیں، سیر و تفریح کے مقامات کی نوعیت اور طریقے سب اُس قوم کے نظریات کی عملی تفسیریں بن کر اقوام عالم کے سامنے آجاتے ہیں۔ بابل کے معلّق باغات ہوں یا اہرام مصر، یونان کے بادشاہوں کے محلات اور تھیٹر ہوں یا ایران کے جمشید بادشاہ کے محلات، بنو عباس کا بغداد ہو یا ہندوستان کے راجے مہاراجے سب اپنے اپنے دور میں بقائے دوام کی ایک دبی ہوئی خواہش کو اپنی سوچ، فکر، نظریہ اور مذہب کی حدود اور تصورات کے اندر رہتے ہوئے صفحۂ ہستی پر اپنے 'خوابوں' کی دنیا تعمیر کر کے دنیا سے رخصت ہو گئے۔ اب یہ اہل علم اور دانشور حضرات کا کام ہے نیز باشعور عوام کا بھی کہ وہ دیکھیں کہ کس تہذیب کے مذہب کے مطابق ایک مثالی انسان، مثالی خاندان اور مثالی معاشرہ کے خدوخال کیا تھے؟ یاد رہے کہ اس میں کوئی اختلاف رائے نہیں ہے کہ سچائی، راستی، عدل و انصاف، شرم و حیا، عفت و عصمت، چادر اور چار دیواری کو دنیا بھر میں معروف سمجھا جاتا ہے اور عریانیت، فحاشی، بے حیائی اور بے ہودگی، لچر پن اور سفلی جذبات کا برملا

اظہار اور نمائش کو اخلاقی دیوالیہ پن کا مظہر سمجھا جاتا ہے۔

سرزمین ہند میں ایک وقت میں ہندومت کا عروج تھا اور تقریباً 1000 ق م سے 1000ء تک وقفے وقفے سے شمالی اور جنوبی ہند میں مستحکم ہندو راج رہا ہے اور مجموعی طور پر علاقائی راجے مہاراجے بھی اسی ہندو مذہب کے پیروکار رہتے پھر مشرق بعید سارا اسی ہندومت کے زیر اثر تھا یہاں تک کہ بدھ مت چین جاپان سمیت سارے مشرقی ممالک میں آج بھی موجود ہے۔

ہندومت نے اپنے دور عروج میں بے شمار مندر تعمیر کیے جہاں ان کی سوچ کے مطابق بت پرستی کے لئے بت رکھے گئے اولاً یہ ''معبود'' جو بتوں کے انسان نما مجسّمے تھے سب ''ننگے'' اور بے لباس بنائے گئے۔ دوسرے ان کے مشہور مندر (جو آج مغربی سیّاحوں کے لئے انتہائی دلچسپی کا سامان مہیا کرتے ہیں جہاں بے حیائی اور جنسی اختلاط کے مناظر بھی بڑے بڑے مجسّموں کی شکل میں ایک دو نہیں ہر مندر کے طرز تعمیر میں ہزاروں کی تعداد میں لگا دیے گئے ہیں ایسا ہی ایک 'بے حیائی' کا مظہر بت خانہ اور فحاشی، عریانی کے مجسّموں کا 'منبع' سومنات کا مندر تھا جسے 1030ء میں سلطان محمود غزنویؒ نے توڑ دیا تھا۔ ان مندروں میں غیر ملکی سیاح تو 'سیر سپاٹے' کے لئے جاتے ہیں جبکہ ہندو عوام خاندان سمیت (WITH FAMILY) ان 'مذہبی مقامات' کی 'یاترا' اور 'عبادت' کے لئے جاتے ہیں۔ خدا معلوم باپ اپنی بیٹی کو بیٹے کو بہو کو..... باپ دادا، نانا نانی کی موجودگی میں ان مقامات کی کیا تشریح کرتے ہوں گے۔ اس سے ہندو مذہب کی سوچ، عقائد، نظریات اور اخلاق کے بارے میں ایک رائے بنانے میں مدد ملتی ہے۔

دوسری طرف ہند میں مسلمان بادشاہ بھی حکمران رہے جن میں سب سے طویل اور 'بھارت گیر' غلبہ مغل دور کا ہے۔ زیادہ تفصیل میں نہ جائیں۔ اکبر بادشاہ مذہبی انسان تو کیا اپنی مسلمانی کے بارے میں 'دین الٰہی' ایجاد کر کے ''هم يومئذ اقرب للكفر من الايمان'' کا مصداق تھا تاہم اس کے مقبرے پر بھی 'ننگے بت'، بے حیائی، عریانی، فحاشی کے مناظر آج بھی نہیں نظر آتے شاہ جہاں بادشاہ اکبر بادشاہ سے بہتر مسلمان تھا بادشاہ تھا وسائل تھے مسلمان مؤرخین اُسے کوئی 'ولی اللہ' بنا کر پیش نہیں کرتے اس کی اکلوتی بیوی..... ممتاز محل اس کی محبوبہ تھی اسی سے اس کے ہاں چودہ اولادیں ہوئیں اگر شاہ جہاں کا مزاج عیاشی اور بدکاری کا ہوتا تو وہ کئی

بیویاں اور داشتائیں اپنے 'حرم' میں داخل کر لیتا مگر اس نے ایسا نہیں کیا تھا۔ اس کی بیوی ممتاز محل فوت ہوئی تو صرف اسی کردار اور عفت و عصمت کی سوچ کی وجہ سے ہی اُسے بیوی کے انتقال کا ازحد صدمہ ہوا اور اس نے اس کی یادگار تعمیر کرنے کا فیصلہ کیا تو ''تاج محل'' کے نام سے اپنے نظریات کی روشنی میں ایک 'پیکر محسوس' صفحہ ہستی پر منتقل کر دیا عام ذہن یہ تسلیم کرے گا کہ یہ ایک محبت کی نشانی ہے اور مقتدر باوسائل بادشاہ کی تعمیر کردہ عمارت ہے اس میں اگر ننگے بت ہوتے، جنسی مناظر مجسمائے جاتے اور خشت اوّل سے خشت آخر تک سجا دیے جاتے کوئی اس پر بہت زیادہ معترض نہ ہوتا کہ یہ تو ہے ہی محبت کی نشانی۔

مگر آفریں ہے شاہ جہاں کی مسلمانی سوچ اور مذہب اسلام کی پاکیزہ تعلیمات پر کہ ایک مقتدر باوسائل بادشاہ کی محبت کی یادگار میں ایک بت نہیں ہے آیات قرآنی میں صاف ستھرا سفید پتھر سے تعمیر شدہ، ہوا دار روشن تاج محل ہے جس کے احاطے میں ایک مسجد ہے۔ تعمیراتی توازن (SYMMETRY) قائم رکھنے کے لئے مقبرے کے مشرقی جانب مسجد نما مہمان خانہ ہے مسجد بناتے تو قبر کو سجدے کا شائبہ ہوتا۔

حتیٰ کہ شاہ جہاں اور ممتاز محل کا کوئی بے لباس تو کیا با لباس مجسمہ بھی وہاں نصب نہیں ہے۔ ایک طرف ہندومت کی 'مذہبی عمارتیں' اور 'عبادت گاہیں' جو 'کھجوراہو مندروں' کی شکل میں وسطی ہند میں موجود ہیں (بلکہ پورے بھارت اور نیپال اور مشرقی بعید میں بھی پھیلے ہوئے ہیں)۔ جہاں بے حیائی کے ایسے مناظر ہیں کہ کوئی شریف النفس آدمی فیملی کے ساتھ تو کیا اکیلا بھی جانا پسند نہ کرے نامعلوم آج کا باضمیر ہندو ان مندروں کی یاترا کے دوران اپنے بچے بچیوں کے سامنے اس کی کیا توجیہ پیش کرتا ہوگا۔ دوسری طرف ایک مسلمان بادشاہ کی محبت کی یادگار ہے جو اتنی پاکیزہ، صاف شفاف اعلیٰ انسانی اقدار کی حامل اور فن تعمیر کا جیتا جاگتا شاندار نمونہ ہے۔

یہ تاج محل ہندومت اور اس کی تہذیب کے منہ پر ایک طمانچہ سے کم نہیں۔ کیا کھجوراہو ٹمپلز (KHAJURAHO TEMPLES) اور تاج محل کے "ICON" رکھنے والی دو قومیں ایک ہو سکتی ہیں..... کوئی عقلمند، باشعور، باضمیر اور COMMON SENSE رکھنے والا شخص اس کے حق میں رائے نہیں دے سکتا۔

# خودی اور آرٹ

ڈاکٹر محمد رفیع الدین
کی ''حکمت اقبال'' سے ایک باب

## ثقافت اور تہذیب کا فرق

فعلِ جمیل سے اقبال کا مطلب ایسا فعل ہے جو اپنے مقصد کے لحاظ سے حسین ہو یعنی جس کا مقصد خودی کے کامل نصب العین یا صحیح تصورِ حقیقت سے ماخوذ ہو اور لہٰذا صفاتِ حسن کے مطابق ہو۔ لیکن خودی چونکہ ہمہ تن خدا کی آرزو ہے جو حسن کا مبدا اور منتہا ہے اور دوسری کوئی آرزو نہیں رکھتی۔ وہ اپنی اس آرزو کو مطمئن کرنے کا کوئی طریقہ یا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتی اور ہر وقت اپنی اس آرزو کی تشفی میں مصروف رہتی ہے۔ لہٰذا وہ اپنے ہر فعل کو نہ صرف معنوی طور پر یعنی اس کے مقصد کے اعتبار سے حسین بنانے کی کوشش کرتی ہے بلکہ ہر فعل کی ظاہری صورت کو بھی خوبصورت بناتی ہے۔ خودی کی فطرت اس قسم کی ہے کہ انسان کوئی کام ایسا نہیں کرتا جس کو وہ معنوی طور پر ہی نہیں بلکہ ظاہری طور پر بھی خوبصورت بنانے کی کوشش نہ کرے۔ انسان کی روز افزوں ضروریاتِ زندگی کا بہت تھوڑا حصہ ایسا ہے جو بقائے حیات کے لئے ضروری ہے۔ ان کا بیشتر حصہ انسان کی آرزوئے حسن کی تسکین کا سامان ہے جس سے انسان زندگی کے ماحول کی تحسین اور تزئین کا کام لیتا ہے۔ انسان کی تمنائے حسن کی کوئی انتہا نہیں اس لئے اس کی حسن آفرینی کی بھی کوئی حد نہیں۔ یہی سبب ہے کہ جوں جوں تہذیب ترقی کرتی جاتی ہے۔ ہماری ضروریات بڑھتی جاتی ہیں۔ ہم زمانۂ حال کے انسان کو دیکھیں تو ہمیں نظر آتا ہے کہ وہ نہ صرف اپنے لباس کی ساخت میں اور اپنے مکان کی تعمیر اور شکل وصورت میں، اپنے میزوں، کرسیوں، صوفوں، قالینوں، تصویروں اور گھر کے دوسرے سامان کی ترتیب اور ترکیب میں، بلکہ اپنے رہنے

سہنے، کھانے پینے، بولنے، چلنے پھرنے، اٹھنے بیٹھنے، کھیلنے اور سفر کرنے کے طور پر طریقوں میں بھی حسن پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے اور نہ حسن آفرینی کی کوششوں سے تھکتا ہے اور نہ حسن سے سیر ہوتا ہے۔ ثقافت یا کلچر نصب العین کی معنویت کو یا اس کے باطنی حسن کو علم، اخلاق، سیاست، تعلیم، قانون اور حصول نصب العین کے لئے ایسے ہی دوسرے اعمال و افعال میں آشکار کرنے کا نام ہے۔ لیکن تہذیب جسے کہتے ہیں وہ زندگی کے ظاہری ماحول میں حسن طلبی اور حسن آفرینی ہے۔

خدا کی دوسری صفات کی طرح حسن آفرینی کی صفت میں بھی انسانی خودی.....
خدا کے وجود کا عکس ہے کیونکہ خدا کی تخلیقی فعلیت بھی جس کا نتیجہ یہ کائنات ہے اپنے معنی اور مقصد اور مدعا کے لحاظ سے ہی نہیں بلکہ اپنے نتائج کی ظاہری شکل وصورت کے لحاظ سے بھی حسین ہے۔ کائنات حسن سے لبریز ہے، ضیائے حسن اس کے ہر ذرہ میں چمک رہی ہے خدا نے کوئی چیز ایسی نہیں بنائی جو حسین نہ ہو، لیکن ہوسکتا ہے کہ ہم بعض چیزوں کے حسن کی پہچان سے قاصر رہ جائیں۔

محفلِ قدرت ہے اک دریائے بے پایاں حسن
آنکھ اگر دیکھے تو ہر قطرہ میں ہے طوفانِ حسن
حسن کوہستان کی ہیبت ناک خاموشی میں ہے
مہر کی ضو گستری شب کی سیاہ پوشی میں ہے
آسمان صبح کی آئینہ پوشی میں ہے یہ
شام کی ظلمت شفق کی گل فروشی میں ہے یہ
ساکنانِ صحن گلشن کی ہم آوازی میں ہے
ننھے ننھے طائروں کی آشیاں سازی میں ہے

حسن ازل کی پیدا ہر چیز میں جھلک ہے — انسان میں وہ سخن ہے، غنچے میں وہ چٹک ہے
یہ چاند آسماں کا، شاعر کا دل ہے گویا — واں چاندی ہے جو کچھ، یاں درد کی کسک ہے
اندازِ گفتگو نے دھوکے دیے ہیں ورنہ — نغمہ ہے بوئے بلبل، بُو پھول کی چہک ہے
کثرت میں ہو گیا ہے وحدت کا راز مخفی — جگنو میں جو چمک ہے، وہ پھول میں مہک ہے

## ہنر یا آرٹ کی تعریف

ایسا عمل جس میں کسی محسوس اور مرئی چیز کو ذریعہ یا واسطہ (MEDIUM) بنا کر حسن کا اظہار کیا گیا ہو، ہنر یا فن یا آرٹ کہلاتا ہے۔ ہم نے دیکھا ہے کہ انسان کا ہر کام اظہارِ حسن کا واسطہ بن سکتا ہے اور بنتا ہے لیکن جب حسن کے اظہار کے لئے اینٹ یا پتھر یا صوت یا صدا یا رنگ یا لفظ یا حرکت کو واسطہ بنا کر اس میں حسن کا اظہار کیا جائے تو جو فن اس سے پیدا ہوتا ہے اسے اسی ترتیب کے ساتھ تعمیر، مجسمہ سازی، سرود، موسیقی، مصوری، شاعری اور رقص کا نام دیا جاتا ہے۔ ہنر کی ان اقسام کے اندر تخلیقِ حسن یا مشاہدۂ حسن سے لطف اندوز ہونا ایک خاص قسم کی تربیت چاہتا ہے اس لئے ہر انسان ان کو تخلیقِ حسن یا مشاہدۂ حسن کے ذرائع کے طور پر کام میں نہیں لا سکتا۔ لہٰذا ہنر یا فن کی حیثیت سے زندگی کے عام کاموں کی تحسین اور تجمیل کے مقابلہ میں ان کی افادیت بہت محدود ہو جاتی ہے۔ تاہم ان میں سے ہر ایک، ایک خاص گروہ کو جو اس سے مستفید ہونے کی مہارت رکھتا ہے، متاثر کر سکتا ہے۔

## حُسن کے دو پہلو: صداقت اور نیکی

ہنر کی حقیقت سے تعلق رکھنے والی ایک اہم بات یہ ہے کہ صداقت، نیکی اور حسن خدا کی صفات ہیں۔ ان میں سے ہر ایک حسن بھی ہے نیکی بھی ہے اور صداقت بھی۔ گویا صداقت اور نیکی حسن ہی کے دو پہلو ہیں۔ لہٰذا اگر حسن صداقت سے یا نیکی سے عاری ہو تو وہ حسن نہیں رہتا۔ ہر عمل جو کچھ وہ ہوتا ہے اپنے اندرونی مدعا یا مقصد اور اپنی ظاہری صورت دونوں سے مل کر بنتا ہے۔ اس لئے اگر کسی عمل کی ظاہری صورت حسین ہو لیکن اس کے پیچھے مدعا حسین نہ ہو تو اس کا حسن داغدار ہو جاتا ہے اور وہ اپنی کلی یا مجموعی حیثیت سے حسین نہیں رہتا۔ حسن کلی طور پر حسن ہوتا ہے اور زشتی کی ملاوٹ کو گوارہ نہیں کرتا۔ اگر زشتی اس میں شامل ہو جائے تو وہ جزوی طور پر نہیں بلکہ ایک کل کی حیثیت سے حسین نہیں رہتا۔ حسن ایک ناقابل تقسیم کل ہوتا ہے اور اسے اجزاء میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا کہ ہم کہہ سکیں کہ کوئی چیز آدھی زیبا ہے اور آدھی زشت۔ زشتی ہمیشہ زیبائی اور زشتی کے امتزاج سے بنتی ہے۔ کوئی چیز جس کے متعلق ہمارا فیصلہ ہو کہ وہ زشت ہے مکمل طور پر زشت نہیں ہوتی۔

؎ باطل دوئی پسند ہے حق لا شریک ہے
شرکت میانہ حق و باطل نہ کر قبول

## گھٹیا آرٹ

چونکہ آرٹ خودی کی آرزوئے حسن کا ایک پہلو ہے ضروری ہے کہ یہ آرزوئے حسن کے اصل مقصود یعنی طلبِ جمالِ حقیقی کے ساتھ اور آرزوئے حسن کے دوسرے ممد ومعاون پہلوؤں یعنی طلبِ خیر اور طلبِ صداقت کے ساتھ مطابقت رکھتا ہو۔ لہٰذا جو آرٹ (خواہ وہ شعر ہو یا رقص یا مصوری یا موسیقی یا کوئی اور) بداخلاقی کی طرف ایما کرتا ہو.....وہ اخلاقی حیثیت سے ہی نہیں بلکہ مطلق آرٹ کی حیثیت سے بھی پست اور گھٹیا ہوتا ہے۔ ایسا آرٹ خودی کی آرزوئے حسن کا خالص اظہار نہیں ہوتا۔ بلکہ اس میں خودی کی آرزو کا اظہار جبلتی خواہشات کے اظہار کے ساتھ ملوث ہوتا ہے' وہ خالص خودی کا عمل یا انسانی عمل نہیں ہوتا بلکہ انسانی اور حیوانی اعمال کا امتزاج ہوتا ہے۔ ایسے آرٹ کا دیکھنا یا تخلیق کرنا وہ خاص قسم کا سرور پیدا نہیں کرسکتا جو سچے آرٹ کا امتیاز ہے اور اس سرور سے بالکل مختلف ہے جو جبلتوں کی تشفی سے حاصل ہوتا ہے۔

## سچا آرٹ

تاہم اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہمیں آرٹ کو بتکلف نیکی یا اخلاق کی خدمت کے لئے وقف کرنا چاہئے۔ سچا آرٹ جستجوئے حسن کے سوائے اور کوئی مقصد نہیں رکھتا۔ خودی کی ہر فعلیت کی طرح آرٹ بھی خودی کی آرزوئے حسن کا آزادانہ اظہار ہوتا ہے جو خود بخود اور بغیر کسی پابندی یا تکلف یا غرض کے فقط اپنی ہی خاطر عمل میں آتا ہے۔ لیکن سچا آرٹ چونکہ حسن کی سچی جستجو کرتا ہے وہ خود بخود خیر اور صداقت اور حسنِ حقیقی کی جستجو سے مطابقت پیدا کر لیتا ہے تاکہ اپنے آپ کو آرٹ کی حیثیت سے درست اور مکمل بنالے۔ اگر وہ خیر اور صداقت کو نظر انداز کر دے تو پھر نہ وہ حسن کا اظہار ہی رہ سکتا ہے اور نہ آرٹ۔ جب تک آرٹ جبلتوں کے دباؤ سے اور بدی اور بداخلاقی کے اثر سے آزاد نہ ہو اور نیکی اور صداقت کو پوری طرح سے ملحوظ نہ رکھے.....وہ نہ تو خودی کی آزادانہ فعلیت ہی ہوسکتا ہے اور نہ ہی آرٹ کہلا سکتا ہے لیکن ہم دیکھ چکے ہیں کہ ایک اعلیٰ درجہ کا فعلِ جمیل جو نیکی کے بلند ترین معیار پر پورا اتر سکے.....صرف خدا کی محبت کے درجۂ کمال پر ہی ممکن ہوسکتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم سچے آرٹ کی توقع صرف اس شخص سے کر سکتے ہیں جس کا تصورِ حقیقت فی الواقع حسین ہو یعنی سچا خدا ہو اور جس کی خودی خدا کی محبت کے کمال کو پا چکی ہو۔ جس

شخص کا تصورِ حقیقت حسین نہیں ہوگا یعنی خدا کے سوائے کوئی اور ہوگا جیسا کہ مثلاً ایک کافر یا منکرِ خدا کا تصور تو اس کا آرٹ بھی خود بخود اس کے نازیبا اور ناقص تصورِ حقیقت کے ساتھ مطابقت پیدا کر کے پایۂ حسن سے گر جائے گا۔ یہی صورت حال کم وبیش اس شخص کے ساتھ پیش آئے گی جس کا تصورِ حقیقت تو صحیح اور حسین ہے لیکن جس کو اپنے تصورِ حقیقت کے ساتھ ایسی کامل اور خالص محبت نہیں جو غلط تصورات کی محبت کے ساتھ ذرا بھی ملوث نہ ہو۔ چونکہ آرٹ ہمیشہ فنکار کے تصورِ حقیقت کے ساتھ مطابقت پیدا کر لیتا ہے اس لئے یہ کہنا درست ہے کہ سچا آرٹ ایک مکمل طور پر آزاد فعلیت ہونے اور آرٹ برائے آرٹ ہونے کے باوجود ہمیشہ خود بخود مقاصدِ زندگی کا ترجمان اور خدمت گزار ہوتا ہے۔

سچا علم اور سچا آرٹ دونوں حسنِ حقیقی یعنی خدا کی محبت کے دو پہلو ہیں جو اسی کی خدمت اور اعانت کے لئے اپنا وجود رکھتے ہیں۔

؎ علم و فن از پیش خیزان حیات
علم و فن از خانہ زادان حیات

اس شعر میں حیات سے اقبال کی مراد آرزوئے حسن یا خدا کی محبت ہے۔ کیونکہ اقبال اپنے کلام میں جس چیز کو حیات کہتا ہے وہی ارتقا انسانی سطح پر آرزوئے حسن یا خدا کی محبت کی صورت میں نمودار ہوتی ہے۔

## خدا کی آرزو اور آرٹ کا تعلق

فن کی ہر قسم خواہ وہ مصوری (رنگ) ہو یا تعمیر (خشت) ہو یا مجسمہ سازی (سنگ) ہو یا موسیقی (چنگ) ہو یا شاعری (حرف) ہو یا گانا (صوت) ہو انسان کی آرزوئے حسن سے پیدا ہوتی ہے جس کا اصل مقصود خدا اور صرف خدا ہے۔ اقبال اسی آرزوئے حسن یا خدا کی محبت کو کبھی خونِ جگر کبھی خونِ دل اور کبھی جنون کہتا ہے۔ آرزوئے حسن پتھر کی سل کو ایک مجسمہ کی صورت میں تبدیل کر کے دل (یعنی جذبات محبت کا مرکز) بنا دیتی ہے۔ یہی آرزوئے حسن صدا کو پُرسوز اور پُرسرور بنا کر ایک گانے میں تبدیل کر دیتی ہے۔

فن کے تمام نقوش جو آرزوئے حسن کے اصل مقصود یعنی خدا کی سچی محبت سے بے تعلق

ہوں، ناقص اور ناتمام رہ جاتے ہیں۔اسی طرح سے وہ نغمہ بھی جو آرزوئے حسن کے اصل مقصود سے بیگانہ ہو بے اثر اور بے سود ہے اور سودائے خام سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔ وہ مردہ اور بے معنی ہے اور ایک ایسی آگ کی طرح ہے جو بجھ کر راکھ بن چکی ہو۔ایسی آگ میں سوز کہاں ہوتا ہے لیکن وہ نغمہ جو خدا کی محبت کے سوز میں ڈوبا ہوا ہو اس کے اثر کی وجہ سے اسے خونِ دل میں حل کی ہوئی آتش سوزاں کہنا چاہیئے۔

رنگ ہو یا خشت وسنگ، چنگ ہو یا حرف وصورت
معجزۂ فن کی ہے خونِ جگر سے نمود
قطرۂ خونِ جگر سل کو بناتا ہے دِل
خونِ جگر سے صدا، سوز و سرور و سرود
نقش ہیں سب ناتمام خونِ جگر کے بغیر
نغمہ ہے سودائے خام خونِ جگر کے بغیر

نغمہ مے باید جنون پروردہ　　آتشے در خون دل حل کردہ
نغمہ گر معنی ندارد مردہ ایست　　سوز آواز آتش افسردہ ایست

صحیح تصورِ حقیقت یعنی خدا کے تصور میں وہ سارا حسن موجود ہے جس کی خودی کو آرزو ہے۔ لہٰذا خدا کے ذکر اور فکر اور فعلِ جمیل کے ذریعہ سے خودی اس قابل ہو جاتی ہے کہ اپنی آرزوئے حسن کو پوری طرح سے مطمئن کرے اور اس طرح سے اپنی محبت کو درجۂ کمال پر پہنچا دے۔اس مقام پر پہنچ کر خودی کو ذکر اور فکر اور فعلِ جمیل سے ایسا سرور حاصل ہوتا ہے جو بیان سے باہر ہے۔لہٰذا جو شخص اس مقام پر پہنچ جاتا ہے اسے وہ سرور ہیچ نظر آتا ہے جو اکثر اشخاص آرٹ یا فن سے حاصل کرتے ہیں اور ایسا شخص اگر فنکار ہو تو وہ اپنے فن سے خود ایسا سرور حاصل کرتا ہے اور اس کو دوسروں کے لئے بھی ایسے سرور سے بھر دیتا ہے جو کسی ایسے فنکار کے لئے ممکن نہیں ہوتا جو خدا کو نہ مانتا ہو یا خدا کو ماننے کے باوجود اپنی محبت کی پوری پوری نشو ونما کرنے سے محروم رہ گیا ہو۔اس کی وجہ یہ ہے کہ اس شخص کا فن اس کے لئے مشاہدۂ حسن کی اس لذت کو پھر زندہ کر دیتا ہے جس سے وہ پہلے آشنا ہوتا ہے۔لہٰذا ایسے شخص کا فن محض فن کی حیثیت سے درجۂ کمال پر ہوتا ہے۔بعض

اشخاص زندگی کی پریشانیوں سے عارضی طور پر نجات پانے اور تفریح حاصل کرنے کے لئے فن کی پناہ لیتے ہیں۔ایسے لوگ اس لذت سے نا آشنا ہوتے ہیں جو خدا کی مخلصانہ عبادت میں انسان کو حاصل ہوتی ہے۔اگر چہ تمنائے حسن یا خدا کی محبت کے اظہار سے خودی کو جو لذت حاصل ہوتی ہے اس کی نوعیت میں اظہارِ تمنا کے طریق کے بدل جانے سے کوئی فرق نہیں آتا، تاہم تمنائے حسن کے اظہار کے بعض طریقے اس تمنا کی تسکین اور تشفی کے لئے دوسرے طریقوں سے زیادہ موثر ہیں۔مثلاً خدا کے ذکر کے ذریعہ سے خودی جس قدر اپنی تمنائے حسن کی تشفی یا تسکین کر سکتی ہے وہ اس سے بہت زیادہ ہے جو آرٹ کے ذریعہ سے ممکن ہوتی ہے۔لہٰذا ذکر کے ذریعہ سے اس تشفی اور تسکین کے عمل کے دوران خودی کو جو سرور حاصل ہوتا ہے وہ بھی اس سے بہت بڑھ کر ہوتا ہے جو آرٹ کے ذریعہ سے اسے حاصل ہوسکتا ہے۔

## آرٹ کی دو خطرناک قسمیں

آرٹ چونکہ خودی کی آرزوئے حسن کی تشفی کا عمل ہے اس سے بھی خودی کی محبت ترقی کرتی ہے۔لیکن آرٹ کی بعض قسمیں ایسی ہیں مثلاً سرود، رقص، مصوری اور مجسمہ سازی جو آسانی سے جنسی تلذذ کا سامان بن جاتی ہیں۔اس قسم کے آرٹ کو پاکیزہ بھی بنایا جاسکتا ہے لیکن اگر مکمل طور پر ایسا کرنا مشکل ہو تو خودی کی حفاظت اور تربیت کے لئے اس سے احتراز ضروری ہے کیونکہ پھر یہ آرٹ کے مقام سے گر کر فقط جنسی اپیل کا ایک ڈھنگ بن کر رہ جاتا ہے۔جب بھی ہم اس قسم کے آرٹ کا مشاہدہ کریں ہمیں دھوکا نہیں کھانا چاہئے کہ یہ آرٹ ہے۔اس قسم کا آرٹ خودی کے لئے موت کا پیغام ہے۔

وہ مغنی جس کا دل پاک نہیں اپنے سانس سے نغمہ کو زہر آلود کر دیتا ہے

نوا کو کرتا ہے موجِ نفس سے زہر آلود
وہ نے نواز کہ جس کا ضمیر پاک نہیں

مرجعِ عقیدت انسانوں کی تصویر کشی اور مجسمہ سازی بالخصوص آرٹ کی ایسی قسمیں ہیں جو ایک حد تک انسان کے مخلصانہ ذوقِ عبادت اور جذبۂ یک بینی و یک پرستی کو چرانے اور ایک غیر محسوس طریق پر خدا سے ہٹانے کا ذریعہ بن جاتی ہیں۔ایسے آرٹ سے بھی احتراز خودی کی

پوری پوری نشو ونما کے لئے ضروری ہے۔

## سینما

اس وقت سینما کی جو حالت ہے اس کا جو تاجرانہ مقصد اور مدعا ہے اور اس کے پیچھے زندگی کا جو سفلی اور حیوانی نقطۂ نظر کام کر رہا ہے اس کے پیش نظر ہمیں سینما کو بھی آرٹ کی ایسی ہی اقسام میں شمار کرنا چاہئے۔ اقبال کی نگاہ میں یہ عہدِ قدیم کی بت فروشی اور بت گری کی ایک صورت ہے۔ وہ بت گری کوئی آرٹ (صنعت) نہ تھی بلکہ کافری کا ایک تقاضا تھا۔ یہ بھی کوئی آرٹ نہیں بلکہ ایک قسم کی ساحری ہے اور تہذیبِ نو کی پیدا کی ہوئی ایک تجارت ہے جس کا مقصد جلبِ زر کے سوائے اور کچھ نہیں۔ اقبال اسے بت سازی اور بت پرستی اس لئے کہتا ہے کہ یہ انسان کی آرزوئے حسن کو خدا سے ہٹا کر غلط راستہ پر ڈالتا ہے اور بت پرستی بھی ایسا ہی کرتی ہے۔ انسان کی تفریح کا سارا سامان آرزوئے حسن کی صحیح تشفی سے پیدا ہونا چاہئے۔ ورنہ اس کی تفریح اس کی خودی کی نشو ونما کے لئے مضر ہوتی ہے اور اس کا انجام مسرت نہیں بلکہ حزن و ملال کی صورت میں رونما ہوتا ہے۔

وہی بت فروشی، وہی بت گری ہے — سینما ہے یا صنعتِ آزری ہے
وہ صنعت نہ تھی، شیوۂ کافری تھا — یہ صنعت نہیں، شیوۂ ساحری ہے
وہ مذہب تھا اقوامِ عہدِ کہن کا — یہ تہذیبِ حاضر کی سوداگری ہے

## تمثیل

اسی طرح سے تیاتر یا تمثیل بھی خودی کی تربیت کے لئے خطرناک ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کا کمال اس بات پر منحصر ہوتا ہے کہ اداکار اپنے آپ کو بالکل مٹا دے اور اپنی جگہ اس شخص کی خودی کو پوری طرح سے کارفرما کر دے جس کا کردار وہ ادا کر رہا ہے۔ ایک انسان اپنی شخصیت اور اس کے اندر جاگزیں ہونے والی آرزوئے حسن کا اس سے زیادہ برا استعمال اور کیا کر سکتا ہے کہ وہ اپنے دل میں جو خدا کا گھر ہے خدا کے سوائے اوروں کی خودی کو بساتا ہے جس طرح سے اسلام سے پہلے کافروں نے خانہ کعبہ میں لات و منات ایسے بت پوجا کے لئے کھڑے کر دیئے تھے۔ ایسے کفر سے خدا کی پناہ۔ انسان کی زندگی اس کی خودی پر منحصر ہے۔ اس کی مسرت، اس کی محبت،

اس کی ذات کا تسلسل اور ثبات اور اس کی صفات سب کا دارومدار اس کی خودی پر ہے۔ اگر وہ اپنی خودی کو ہی مٹا دے تو پھر اس کے پاس اور کیا چیز رہ جاتی ہے جس کی بنا پر اسے زندہ سمجھا جائے۔ چونکہ انسان کی خودی خدا کی طلب گار ہے اس کا مقام مہ و پروین سے بھی اونچا ہے۔ انسان اسی کی وجہ سے معزز اور مکرم ہے۔ اسے غیر اللہ کے لئے وقف کرنا اپنی تذلیل ہے۔

تری خودی سے ہے روشن ترا حریمِ وجود　　حیات کیا ہے، اسی کا سرور و سوز و ثبات
بلند تر مہ و پروین سے ہے اُسی کا مقام　　اسی کے نور سے پیدا ہیں تیرے ذات و صفات
حریم تیرا، خودی غیر کی! معاذ اللہ　　دوبارہ زندہ نہ کر کاروبارِ لات و منات
یہی کمال ہے تمثیل کا کہ تو نہ رہے　　رہا نہ تو تو نہ سوزِ خودی، نہ سازِ حیات

ظاہر ہے کہ جن حقائق کی بنا پر تیاتر یا تمثیل خودی کی تربیت کے لئے مضر ہے وہ اداکاری کی تمام قسموں پر صادق آتے ہیں۔

## ہنروران ہند کا آرٹ

ہنروران ہند کا آرٹ جنسیت میں ڈوبا ہوا ہے لہٰذا گھٹیا اور پست ہے۔ ان کا تخیل اس قسم کا ہے کہ انسان کے دل سے عشق و مستی یعنی خدا کی محبت رخصت کر دیتا ہے۔ ان کا تاریک فکر قوموں کے لئے ہلاکت ہے۔ یہ ہنرور خدا پرست نہیں بلکہ برہمنوں کی طرح بت پرست ہیں اور ان کے صنم خانوں میں موت کی تصویریں بنا کر رکھی گئی ہیں یعنی ان کے ہنر کی مخلوقات افراد اور اقوام کے لئے موت کا حکم رکھتی ہیں۔ ان کا ہنر انسانوں کو یہ جاننے سے باز رکھتا ہے کہ ان کی خودی ترقی کر کے بلند مقامات تک پہنچ سکتی ہے۔ وہ اپنے ہنر سے بدن کی خواہشات کو تو بیدار کرتے ہیں لیکن روح یا خودی کی خواہشات کو سلاتے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک خواہ وہ شاعر ہے یا مصور ہے یا افسانہ نویس.....عورت کی کشش کے فریب میں مبتلا ہے۔

ے　　عشق و مستی کا جنازہ ہے تخیل اُن کا
ان کے اندیشۂ تاریک میں قوموں کا مزار
موت کی نقش گری ان کے صنم خانوں میں
زندگی سے ہنر ان برہمنوں کا بیزار
چشمِ آدم سے چھپاتے ہیں مقاماتِ بلند

کرتے ہیں روح کو خوابیدہ بدن کو بیدار
ہند کے شاعر و صورت گر و افسانہ نویس
آہ! بیچاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار!

## عجم کا شعر

شعر کا مقصد یہ ہونا چاہئے کہ وہ خدا کی محبت کی پرورش کرے اور اسے یہاں تک ترقی دے کہ انسان کی خودی باطل کو فنا کرنے کے لئے تلوار کی طرح تیز ہو جائے جس کی وجہ سے انسان دنیا کو خدا کی مرضی کے مطابق بدلنے کے لئے پرجوش، زوردار اور انقلاب آفریں عمل پر آمادہ بن سکے۔ اگر مرغ سحر خیز کا نغمہ گلستان میں رونق نہیں لاتا بلکہ اسے اور بے رونق کر دیتا ہے تو اس سے بہتر ہے کہ وہ خاموش ہی رہے۔ کائنات کی رونق یہ ہے کہ اس میں حسن اور نیکی اور صداقت کا دور دورہ ہو۔ اگر شاعر کا شعر خدا کی اس کائنات میں بدی اور زشتی کو دور کر کے نیکی اور حسن اور صداقت کے اوصاف کو جو خدا کی محبت کے مقامِ کمال ہی سے صادر ہو سکتے ہیں' پھیلانے اور عملی طور پر موثر کرنے کی کوشش نہیں کرتا تو شعر کا ہونا، نہ ہونا برابر ہے۔ مانا کہ عجم کا شعر بڑا دلکش اور دل آویز اور بڑا زوردار اور موثر ہے یہاں تک کہ پہاڑ کے ٹکڑے اڑا دیتا ہے۔ لیکن اگر وہ شمشیر خودی کو تیز نہیں کرتا اور اگر ایک پرویز کی سلطنت یعنی باطل کی قوت اس سے شکستہ نہیں ہوتی تو اس کا اثر کس کام کا ہے۔

ے ہے شعرِ عجم گرچہ طربناک و دل آویز
اس شعر سے ہوتی نہیں شمشیرِ خودی تیز
افسردہ اگر اس کی نوا سے ہو گلستان
بہتر ہے کہ خاموش رہے مرغِ سحر خیز
وہ ضرب اگر کوہ شکن بھی ہو تو کیا ہے
جس سے متزلزل نہ ہوئی دولتِ پرویز

## سرودِ حرام

فقیہوں میں یہ بحث چلی آتی ہے کہ سرود حلال ہے یا حرام لیکن اگر ہم اسرارِ حیات یا

خودی کے اوصاف وخواص کی روشنی میں دیکھیں تو اس بحث کا فیصلہ آسان ہے۔ وہ سرود جو خدا کی محبت سے بیگانہ کرنے والا ہو حرام ہے کیونکہ وہ خودی کے لئے موت کا پیغام ہے اور ظاہر ہے کہ زندگی موت پر مقدم ہے اور ہم زندگی دے کر موت کو خرید نہیں سکتے۔

؎ اگر نوا میں ہے پوشیدہ موت کا پیغام
حرام میری نگاہوں میں نالے و چنگ و رباب

خودی کے اوصاف وخواص کے پیش نظر خدا کی محبت سے محرومی انسان کے لئے موت ہے۔

؎ آن کہ بے حق زیست جز مردار نیست
گرچہ کس در ماتم او زار نیست

بے شک گانے والے کی لَے کی بلندی اور پستی سے جو گانے میں دلکشی پیدا ہوتی ہے اس سے دل کو بڑی مسرت حاصل ہوتی ہے اور اگر دل میں غم یا خوف کی کیفیت موجود ہو تو جاتی رہتی ہے۔ لیکن اگر مغنی کا سرود خدا کی محبت کے جذبہ کو کچلنے والا ہو تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ سننے والے کا دل مر جائے گا اور زندہ اور پائندہ نہ رہے گا۔ اگر دل خود ہی مر گیا تو دل کی کشود کس کام آئے گی۔ اگر نوا ایسے دل سے نکلے جس میں خدا کی سچی محبت کا سوز درحقیقت موجود ہو تو اس نوا کے اثر سے ستاروں کا وجود بھی؛ جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ انسانوں کی قسمتوں پر حکمران ہیں؛ پگھل سکتا ہے اور پوری دنیا مغنی کی مرضی کے مطابق بدل سکتی ہے۔ اگرچہ ایسی نوا کائنات میں بالقوہ موجود ہے اور کائنات کی ممکنات میں پوشیدہ ہے۔ تاہم ابھی بالفعل اور آشکار نہیں ہوئی۔ ایسا سرود جس کی تاثیر سے آدم مستقل طور پر غم اور خوف سے نجات پا کر لاخوف علیھم و لاھم یحزنون کا مصداق بن جائے اور ایازی یعنی غلامی اور شخص پرستی کا مقام محمود غزنوی یعنی بادشاہت اور بت شکنی کے مقام میں بدل جائے اور یہ پوری کائنات جو مہ وانجم کا ایک حیرت خانہ ہے لاموجود میں شمار ہونے لگے اور صرف تو باقی رہ جائے یا تیرا یہ اعلان کہ سوائے خدا کے اور کوئی موجود نہیں یعنی یہ پرانی کائنات مٹ جائے اور ایک نئی کائنات وجود میں آئے جو تیری اور تیرے محبوب خدا کی مرضی کے مطابق ہو۔ دوسرے لفظوں میں ایسا سرود جسے عارفانِ خودی جائز اور مشروع سمجھتے ہیں؛ ابھی کسی مطرب کا منتظر ہے۔ مراد یہ ہے کہ کائنات خدا کی مرضی کے مطابق ضرور بدل کر رہے گی۔

لیکن اس تبدیلی کا ذریعہ ایک ایسا نغمہ ہی ہوسکتا ہے جس کی تاثیر سے لوگوں کے دل خدا کی محبت کے سوز سے پگھل جائیں۔

کھل تو جاتا ہے مُغنّی کے بم و زیر سے دل
نہ رہا زندہ و پائندہ تو کیا دل کی کشود!
ہے ابھی سینۂ افلاک میں پنہاں وہ نوا!
جس کی گرمی سے پگھل جائے ستاروں کا وجود
جس کی تاثیر سے آدم ہوغم وخوف سے پاک
اور پیدا ہو ایازی سے مقامِ محمود
مہ و انجم کا یہ حیرت کدہ باقی نہ رہے
تو رہے اور ترا زمزمۂ لاموجود
جس کو مشروع سمجھتے ہیں فقیہانِ خودی
منتظر ہے کس مطرب کا ابھی تک وہ سرود!

## منکرِ خدا کا آرٹ

جوشخص اپنی آرزوئے حسن کی تشفی کے لئے خدا کے تصور سے کام نہیں لے سکتا اس لئے کہ وہ خدا کا منکر یا کافر ہے یا خدا کے تصور سے آشنا نہیں اس کا آرٹ اسی گھٹیا قسم کا آرٹ ہوسکتا ہے اگرچہ وہ دیکھنے والوں کے لئے فردوسِ نظر ہو اور وہ یہ محسوس کرنے لگیں کہ اس آرٹ نے ان پر جنت کا ایک دروازہ کھول دیا ہے اور خدا کی قدرت کے رازہائے سربستہ ان پر آشکار کردیے ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ خودی کی تگ ودو سے مادی طور پر ترقی یافتہ بن جانا یا اس جہان سحروشام کے ادوار میں سے دور جدید کا انسان بن جانا ایسے کارہائے نمایاں بھی حق و باطل اور زشت وزیبا کی اس حریفانہ کشمکش سے..... جو انسانی زندگی کی ایک خصوصیت کے طور پر انسان کے ضمیر کے اندر اور باہر جاری ہے'..... انسان کو نجات نہیں دلا سکتے۔ اس سے نجات پانے کا طریق صرف یہ ہے کہ انسان خدا پر ایمان لائے اور خدا کی محبت کو ترقی دے کر کمال پر پہنچائے۔ اس زمانہ کے کافر نے ایک نئی قسم کی بت پرستی کو' جس میں لات ومنات کی بجائے وطن اور قوم اور رنگ ونسل کو اصنام بنایا

جاتا ہے' اپنا شعار بنالیا ہے۔ خدا سے بیگانگی کے اس زمانہ میں اس کافر سے ہم اس سچے آرٹ کی توقع کیسے کر سکتے ہیں جو صرف عشق حقیقی سے زندگی پانے والوں کا ہی امتیاز ہے' وہ مر چکا ہے اور یہی اس کا آرٹ جو غیر حسن کو حسن' موت کو حیات اور قبر کی تاریک رات کو زندگی کی روشنی سمجھتا ہے اس کا جنازہ پڑھا رہا ہے۔

ے ہے یہ فردوسِ نظر اہلِ ہنر کی تعمیر
فاش ہے چشمِ تماشا پہ نہاں خانۂ ذات
نہ خودی ہے، نہ جہانِ سحر و شام کے دَور
زندگانی کی حریفانہ کشاکش سے نجات
آہ، وہ کافرِ بے چارہ کہ ہیں اُس کے صنم
عصرِ رفتہ کے وہی ٹوٹے ہوئے لات و منات!
تو ہے میت، یہ ہنر تیرے جنازے کا امام
نظر آئی جسے مرقد کے شبستان میں حیات!

## انسان کی تمام اعلیٰ سرگرمیوں کا مقصد خودی کی حفاظت اور تربیت ہے

سرود اور شعر اور ہنر کی دوسری قسمیں ہی نہیں بلکہ ادب اور دین اور سیاست بھی انسان کے ایسے اعمال ہیں جن کا منبع بندۂ خاکی کا دل یا اس کی آرزوئے حسن ہے۔ یہ اعلیٰ قسم کے اعمال انسان کا خاص امتیاز ہیں اور حیوان کے حصہ میں نہیں آئے۔ ان کا مقصد خدا کی محبت کے اسی جذبہ کی تشفی اور خدمت اور اعانت ہے جو انسان کو اشرف المخلوقات اور خدا کا خلیفہ اور ہم راز اور ہم کار بناتا ہے۔ ان اعمال کے نتائج اور فوائد میں سے ہر ایک اپنی قدر و قیمت میں ایک نایاب اور قیمتی موتی کی طرح ہے۔ لہٰذا اس میں ذرا شک نہیں کہ ان اعمال کا مقام ستاروں سے بھی بلند تر ہے۔ لیکن اگر ان میں سے کوئی خودی کی (یعنی خودی کی محبت کی جو فقط خدا کے لئے ہوتی ہے) حفاظت اور تربیت نہ کر سکے تو محض بے سود اور بیکار ہے کیونکہ اس سے زندگی کے مقصد کو اور اس عمل کے اپنے مقصد کو بھی کوئی فائدہ نہیں پہنچتا اور اگر وہ عمل خودی کی حفاظت اور تربیت کرنے والا ہے تو

عین زندگی ہے۔اس دنیا میں جن قوموں نے اپنے دین اور اپنے ادب کو خودی کی تربیت اور ترقی کے مقصد سے بے تعلق کر لیا تھا وہ ذلیل ہو کر رہی ہیں۔

سرود و شعر و سیاست، کتاب و دین و ہنر
گہر ہیں ان کی گرہ میں تمام یکدانہ
ضمیر بندہ خاکی سے ہے نمود ان کی
بلند تر ہے ستاروں سے ان کا کاشانہ
اگر خودی کی حفاظت کریں تو عین حیات
نہ کر سکیں تو سراپا فسوں و افسانہ
ہوئی ہے زیرِ فلک امتوں کی رسوائی
خودی سے جب ادب و دین ہوئے ہیں بیگانہ

اگر آرٹ میں خودی کی تعمیر یعنی خدا کی محبت کی نشو ونما کرنے کی صلاحیت نہ ہو تو خواہ وہ مصوری ہو یا شاعری ہو یا موسیقی ہو یا گانا وہ افسوناک ہے۔انسان کے لئے زندگی خدا کی محبت ہے اور موت خدا سے دوری۔لیکن افسوس کہ مکتب ہو یا مے کدہ (یعنی آرٹ جو حسن کی نمائش سے مست کرتا ہے) اس وقت دونوں بے خدا ہونے کی وجہ سے موت کا درس دے رہے ہیں۔ہمیں جینا سیکھنا چاہئے اور اصل جینا خودی کا جینا ہے۔اگر ہماری خودی زندہ ہو جائے تو ہم اس دنیا میں بھی زندہ رہیں گے اور اگلی دنیا میں بھی۔بدن کی زندگی جوشرر کی طرح ایک لمحہ سے زیادہ نہیں ہوتی ہماری اصل زندگی نہیں۔انسان کی اصل بدن سے نہیں بلکہ روح سے ہے۔بدن روح سے ہے، روح بدن سے نہیں۔زندہ رہنے کے لئے ہمیں وجود یا زندگی کے لوازمات اور مقدمات اور مدارج کو سمجھنا چاہئے۔

اے کہ ہے زیرِ فلک مثلِ شرر تیری نمود
کون سمجھائے تجھے کیا ہیں مقامات وجود
گر ہنر میں نہیں تعمیر خودی کا جوہر
وائے صورت گری و شاعری و نالے و سرود

مکتب و میکدہ جز درس بنوں دن نہ دہند
بودن آموز کہ ہم باشی و ہم خواہی بود؛

## آرٹ کی تاثیر کا منبع

آرٹ یا ہنر کی ساری مشکلوں اور کوتاہیوں کا سبب سمجھنے کے لئے اس بات پر غور کرنا چاہیے کہ جب ایک نے نواز اپنی نے سے اثر میں ڈوبی ہوئی مست کرنے والی سریں نکالتا ہے تو نے کی آواز میں شراب کا سرور کہاں سے آجاتا ہے۔ یقیناً اس کا منبع نے کی سوکھی ہوئی لکڑی نہیں بلکہ نے نواز کا دل ہے تو پھر یہ دل کیا چیز ہے۔ اس میں مست کرنے کی خاصیت اور اثر پیدا کرنے کی طاقت کہاں سے آئی ہے۔ یہی دل انسان کی خودی ہے جو اصل انسان ہے اور اس دل میں فقط ایک ہی آرزو ہے اور وہ آرزوئے حسن ہے جو صرف خدا کی محبت سے مکمل اور مستقل طور پر مطمئن ہوتی ہے۔ عبادت، علم، اخلاق اور ہنر ایسے اعمال انسان کی اسی آرزوئے حسن کے پہلو ہیں اور اسی کی اعانت کے لئے وجود میں آتے ہیں۔ غلط اور ناقص اور نازیبا تصورات زیبائی کا لباس اوڑھ کر خدا کی محبت کے جذبہ کو اپنی طرف کھینچتے رہتے ہیں لیکن اس کی فطرت کا تقاضا یہ ہے کہ یہ غیر اللہ سے کٹ کر بالکل خدا کے لئے ہو جائے اور جب یہ کلیتاً خدا کے لئے ہو جاتا ہے تو انسان کا دل زندہ ہو جاتا ہے اور وہ سچ مچ صاحب دل بن جاتا ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ صاحب دل ایک نگاہ سے شہنشاہ ایران کا تختہ الٹ سکتا ہے اور اس کی نگاہ میں روم اور شام اور اس کی سلطنتوں کی بھی کوئی حیثیت باقی نہیں رہتی۔ جب دل خدا کی محبت سے زندہ ہوں تو قوم بھی زندہ ہوتی ہے اور جب دلوں سے خدا کی محبت رخصت ہو جائے اور دل مردہ ہو جائیں تو قوم بھی مر جاتی ہے۔ دل کی واردات پے بہ پے بدلتی رہتی ہیں کیونکہ اس میں جلال بھی ہے اور جمال بھی اس کی محبت کو رکاوٹوں کا سامنا ہونے لگے تو یہ جلالی صفات کا مظاہرہ کرتا ہے جس سے محبت کی رکاوٹوں کو فنا کر دیتا ہے اور جب اس کی محبت کو موافق حالات پیش آئیں تو یہ حریر و پرنیاں کی طرح نرم ہو جاتا ہے اور سراسر محبت نظر آنے لگتا ہے۔ اگر ایک فنکار کی ناقص ناتمام اور راہ گم کردہ محبت بھی اس کی نے کے نالوں میں کچھ اثر پیدا کر سکتی ہے تو پھر خود ہی سمجھ لیجئے کہ اگر اس کی محبت اپنے حقیقی محبوب کے لئے ہوگی اور درجہ کمال پر ہوگی تو اس کے نالۂ نے میں تاثیر اور مستی کس درجہ کی ہوگی اور اس کا فن عمدگی

کے کس مقام پر ہوگا۔ اگر فنکار یہ راز پا جائے تو اس کو فن کی تمام مشکلات کا حل یہیں سے ملے گا۔ اقبال اس مضمون کو شعر میں بیان کرتا ہے

آیا کہاں سے نالہ نے میں سرور مے — اصل اسکی نے نواز کا دل ہے کہ چوب نے
دل کیا ہے اسکی مستی وقوت کہاں سے ہے — کیوں اس کی اک نگاہ الٹتی ہے تخت کے
کیوں اسکی زندگی سے ہے اقوام میں حیات — کیوں اسکے واردات بدلتے ہیں پے بہ پے
کیا بات ہے کہ صاحب دل کی نگاہ میں' — جچتی نہیں سلطنت روم و شام و رے
جس روز دل کی رمز مغنی سمجھ گیا — سمجھو تمام مرحلہ ہائے ہنر ہیں طے'

## ہنر کے کمال کا معیار

ایک فن کار کے متعلق بالعموم یہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ اہل نظر ہوتا ہے' حسن کا ذوق رکھتا ہے اور حسن کو غیر حسن سے ممیّز کر سکتا ہے۔ لیکن اگر ایک فن کار خود فن کی حقیقت اور اس کے مقصد سے نا آشنا ہو تو ہم اسے اہل نظر کیسے کہہ سکتے ہیں۔ ہنر کا مقصد یہ ہے کہ انسان کے دل میں خدا کی سچی محبت کا ایسا سوز پیدا ہو جو اس کو زندہ جاوید بنا دے۔ یہ مقصد اسی صورت میں پورا ہو سکتا ہے کہ ہنر کی تخلیق اس قسم کی ہو کہ وہ خدا کی محبت کی نشو ونما کر سکے۔ اگر فنکار غیر حسن کو حسن بنا کر پیش کرے تو اس کا فن بدن کی اس زندگی میں جو شرر کی طرح ایک دو لمحہ کے لئے ہی ہوتی ہے' کسی قدر لذت یا سرور کا باعث ہو تو ہو لیکن نہ تو وہ خدا کی محبت کی تربیت کر سکے گا اور نہ ہی روح کی ابدی زندگی اور اس کی محبت کی ابدی سوز کے لئے مدد ومعاون ثابت ہو سکے گا۔ لیکن بدن کی اس نفس یا دو نفس کی زندگی کی حقیقت کیا ہے کہ فنکار اپنے فن کو اس کا غلام بنا دے۔ ابر نیساں کا قطرہ اگر کسی صدف میں جا پڑے تو وہ گہر بن جاتا ہے۔ فن کار کا جوہر وہ قطرہ نیساں ہی سہی جو اس کے شاہکار کے صدف کو حسن کے گوہر تابدار سے پر کرتا ہے لیکن وہ صدف یا وہ گوہر جو قطرہ نیساں کے کمالات کی تخلیق ہونے کے باوجود دریا میں تلاطم پیدا نہ کر سکے دریا کے لئے بے حقیقت ہے۔ اسی طرح سے فن کار وہ شاہکار اور فن کا وہ حسن جو قوم کے اندر کوئی حرکت پیدا نہ کر سکے قوم کے لئے بے معنی اور بے کار ہے۔ باد سحر سے چمن میں پھول کھلتے ہیں اور یہ صحیح ہے کہ شاعر کی شاعری اور گانے والے کا گانا دونوں چمن قوم کے لئے باد سحر کا کام دے سکتے ہیں۔ لیکن وہ باد سحر بیکار ہے جس سے

قوم کا گلستان شگفتہ ہونے کی بجائے مرجھا جائے۔ایک ایسی قوم جو حالت جمود میں ہو جب تک اس کیلئے کسی معجزہ سے فکر وعمل کی نئی راہیں نہ کھل جائیں وہ انسانیت کی منزل مقصود کی طرف حرکت نہیں کرسکتی۔ہنر ایسا ہونا چاہئے جو عصائے کلیمی کی طرح ہو جس کی ایک ضرب سے بے آب وگیاہ بیابان میں پتھر سے پانی کے چشمے پھوٹ نکلے تھے جو ایک معجزہ کا حکم رکھتا ہو اور ایک حیرت انگیز فکری انقلاب سے قوم کو ارتقاء کے کھوئے ہوئے راستوں پر ڈال سکتا ہو۔اقبال کہتا ہے:

اے اہل نظر ذوق نظر خوب ہے لیکن — جو شے کی حقیقت کو نہ دیکھے وہ نظر کیا
مقصود ہنر سوز حیات ابدی ہے — یہ ایک نفس یا دو نفس مثل شرر کیا
جس سے دل دریا متلاطم نہیں ہوتا — اے قطرہ نیساں وہ صدف کیا وہ گہر کیا
شاعر کی نوا ہو کہ مغنی کا نفس ہو — جس سے چمن افسردہ ہو وہ باد سحر کیا
بے معجزہ دنیا میں ابھرتی نہیں قومیں — جو ضرب کلیمی نہیں رکھتا وہ ہنر کیا

## خطرناک شاعری

اگر شعر خودی کی آرزوئے حسن کے اصل مقصود کو پیش نظر نہ رکھ سکے تو یہ انسانیت کے لئے نہایت ہی خطرناک ثابت ہوسکتا ہے کیونکہ یہ فن کی اور قسموں کی نسبت زیادہ آسانی کے ساتھ عوام تک پہنچ جاتا ہے، اس سے تھوڑے خرچ پر اور بار بار استفادہ کیا جا سکتا ہے، پھر یہ اظہار مطلب کے لئے زیادہ موزوں اور موثر ہے، انسانی جذبات کو زیادہ آسانی کے ساتھ اپنے ضبط میں لاسکتا ہے اور ہماری روزمرہ کی زندگی سے بآسانی تعلق پیدا کرسکتا ہے۔اگر شاعر مقصود حیات سے ناآشنا ہو تو پھر وہ زشتی اور نازیبائی کو حسن بنا کر پیش کرتا ہے انسان کے ارتقاء کی راہ میں ایک رکاوٹ پیدا کر دیتا ہے موت کو زندگی اور زندگی کو موت کا رنگ دے کر سامنے لاتا ہے ایسا زہر تقسیم کرتا ہے جو شہد میں حل کیا گیا ہو بعض اوقات اس کا نقصان حساب سے باہر ہو جاتا ہے کیونکہ وہ لاتعداد انسانوں کی آرزوئے حسن کی غلط راہوں اور غلط منزلوں کی طرف راہ نمائی کر کے ان کو بڑی بڑی مصیبتوں میں مبتلا کر دیتا ہے۔جن سے وہ مر کر ہی نجات پاتے ہیں۔ایسے شاعر کا کلام پھول کو تازگی سے اور بلبل کو ذوق پرواز سے محروم کر دیتا ہے۔گویا اس کے اثر سے نہ حسن میں شوخی باقی رہتی ہے اور نہ عشق میں گرمی۔انسان خیالات کے بحر بیکراں میں غرق ہو جاتا ہے اور عمل سے بیگانہ

ہو جاتا ہے اس کا کلام شراب کی سی مستی ضرور پیدا کرتا ہے لیکن ہر انسان کو اپنی خودی کی سلامتی کے لئے اس کی چمکتی ہوئی شراب سے بچنا چاہیے۔ جس بدقسمت قوم میں ایسا شاعر پیدا ہو وہ اجل سے ہمکنار ہو جاتی ہے۔

| | |
|---|---|
| وائے قومے کز اجل گیرد برات | شاعرش وا بوسد از ذوقِ حیات |
| خوش نماید زشت را آئینہ اش | در جگر صد نشتر از نوشینہ اش |
| بوسۂ او تازگی از گل برد | ذوقِ پرواز از دلِ بلبل برد |
| دریم اندیشہ اندازد ترا | از عمل بیگانہ می سازد ترا |
| از خم و مینا و جامش الحذر | از مۂ آئینہ فامش الحذر |

## مقدس شاعری

اس کے برعکس اگر شعر خودی کی آرزوئے حسن کے مقصود سے آگاہ ہو تو عالم انسانی کے ارتقاء کا ایک مفید اور موثر ذریعہ بن جاتا ہے۔ ایسا شعر کہنے والے شاعر کے متعلق اقبال لکھتا ہے کہ اس کا سینہ حسن کی جلوہ گاہ ہوتا ہے جس سے حسن کا نور پھیلتا ہے۔ وہ اپنے شعر سے جس چیز کی طرف متوجہ ہوتا ہے اس کے حسن میں اضافہ کر دیتا ہے۔ قدرت کا حسن بھی اس کے کلام کے جادو سے زیادہ دلکش اور محبوب ہو جاتا ہے اس کا فکر بلندی میں چاند اور ستاروں تک پہنچتا ہے وہ زشتی کو جانتا ہی نہیں اور حسن کو پیدا کرتا رہتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ قافلے اس کی بانگ درا سے اس کے پیچھے اپنی منزلوں کی طرف چل پڑتے ہیں۔

| | |
|---|---|
| سینۂ شاعر تجلی رازِ حسن | خیزد از سینائے او انوارِ حسن |
| از نگاہش خوب گردد خوب تر | فطرت از افسونِ او محبوب تر |
| فکرِ او با ماہ و انجم ہم نشیں | زشت را ناآشنا' خوب آفریں |
| کاروانہا از درایش گام زن | درپئے آواز نایش گام زن |

جس طرح سے دل جسم کے اندر احساسات کا مرکز ہوتا ہے' شاعر ایک قوم کے لئے جذبات اور احساسات کا مرکز ہوتا ہے وہ اپنی محبت کے سوز سے جو شاعری کی جان ہے' ایک نئی دنیا پیدا کرتا ہے۔ خدا کی محبت کا سوز کائنات کے ہر ذرہ میں ہے اسی سے پوری کائنات کی تعمیر ہوئی

ہے۔وہ شاعری جواس سے خالی ہے ایک طرح کا ماتم ہے۔اگر شعر کا مقصود خدا کی محبت کی بنیاد پر انسانیت کی تعمیر ہوتو وہ نبوت کا وارث ہے۔

شاعر اندر سینہ ملت چو دل ملتے بے شاعرے انبار گل
سوز و مستی نقشبند عالمے است شاعری بے سوز و مستی ماتمے است
شعر را مقصود اگر آدم گری است شاعری ہم وارث پیغمبری است

لہٰذا اقبال شاعر کو دعوت دیتا ہے کہ وہ زندگی کے مقصد کو اپنے ہنر کا معیار قرار دے۔ اگر اس کی شاعری خدا کی محبت کو فروغ دینے کے کام آرہی ہے تو قابل قدر ہے ورنہ نہیں۔

اے میان کیسرات نقد سخن بر عیار زندگی او را بزن'

اگر ہنر کار کا ہنر خدا کی محبت کے جذبہ کی عملی تسکین اور تشفی کے لئے کام نہیں آرہا تو وہ یقیناً قوموں کی بربادی کا سبب بنے گا۔ایسے ہنر سے گریز واجب ہے۔

؎ نہ جدا رہے تو اگر تب و تاب زندگی سے
کہ ہلا کئے امم ہے یہ طریق نے نوازی'

## غلام اور کافر کا آرٹ

چونکہ آرٹ خودی کی آرزوئے حسن کے آزادانہ اظہار پر موقوف ہوتا ہے ایک غلام یا ایک ایسا آدمی جس کا تصور حقیقت صحیح نہ ہو' اعلیٰ قسم کا آرٹ پیدا نہیں کرسکتا۔اکثر اوقات اس کے آرٹ کا مقصد یا فطرت کی نقل ہوتا ہے یا ان افراد کے ذوق کی ترجمانی اور خدمت گزاری جن کو یہ آرٹ محظوظ کرنا چاہتا ہے۔

ایک غلام اپنی پوری آرزوئے حسن کے مطابق ایجاد و تخلیق کی اہلیت سے محروم ہوتا ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کی خودی اپنے صحیح تصور حقیقت کے لئے نہیں بلکہ اپنے آقاؤں کے غلط تصور حقیقت کے لئے سوچنے اور کام کرنے پر مجبور ہوتی ہے۔لہٰذا اس کی ایجاد و تخلیق کی قوتیں اپنا آزادانہ اور مکمل اظہار نہیں پاسکتیں۔اس کا آرٹ جدت کے وصف سے عاری ہوتا ہے۔ آرٹ حسن کے آزادانہ اظہار کا نام ہے چونکہ غلام کا آرٹ حسن کا آزادانہ اظہار نہیں ہوتا لہٰذا وہ سچا آرٹ بھی نہیں ہوتا۔ایک فن کار اپنے آرٹ میں اپنے آپ کا مکمل آزادانہ اظہار اسی صورت

میں کرسکتا ہے جب اس کی خودی ہر قسم کے زشت اور ناقص تصورات حقیقت کے اثر سے آزاد ہو۔ ناقص تصورات حقیقت چونکہ خودی کی فطرت سے مطابقت نہیں رکھتے وہ اس کی آزادی کو سلب کر کے اسے اپنا غلام بنا لیتے ہیں، جس کے بعد وہ اپنے آپ سے بیگانہ ہو جاتی ہے۔ ایسی حالت میں خودی آزادانہ تخلیق کے قابل نہیں رہتی۔ لہٰذا خدا سے کفر اور غلامی دونوں حالتیں اعلیٰ قسم کے آرٹ کے لئے سازگار نہیں۔ بلند ترین سطح کا آرٹ صرف اسی حالت میں ممکن ہے جب فن کار کی خودی ہر قسم کے غلط تصورات حقیقت کے اثر سے مکمل طور پر آزاد ہو۔ خواہ یہ اثر کفر سے پیدا ہو یا غلامی سے۔ غلامی کی حالت میں پیدا ہونے والے فنون لطیفہ کے اندر کئی قسم کی ہلاکتیں مخفی ہوتی ہیں۔ غلامی کے ساحرانہ اثرات کا ذکر کیا جائے۔ غلام کی فنی مخلوقات اس کے دل کی طرح بے نور ہوتی ہیں، اس کی سریں اس کے دبے ہوئے دل و دماغ کی طرح پست ہوتی ہیں، اس کی نے کی آواز ہی سے پتہ چل جاتا ہے کہ وہ غلام ہے، اس کا ساز انسانوں کی ایک پوری بستی کے لئے موت کا پیغام ہوتا ہے۔

مرگ ہا اندر فنون بندگی‘ من چہ گویم از فسون بندگی
چوں دل او تیرہ سیمائے غلام پست چوں طبعش نوا ہائے غلام
از نے او آشکارا راز او مرگ یک شہر است اندر ساز او

☆☆☆☆☆

# انبیاء علیہم السلام کی تعداد

عطاء الرحمن

اللہ تعالیٰ نے بنی نوع انسان کی ہدایت اور رہنمائی کے لیے انبیاء کرام علیہم السلام کی بعثت کا سلسلہ جاری فرمایا تھا جو ابوالبشر حضرت آدم علیہ السلام سے شروع ہوا اور حضرت محمد ﷺ پر اختتام پذیر ہوا۔ قرآن پاک میں ذکر ہے کہ ہر قوم کی ہدایت کے لیے اللہ تعالیٰ کے پیغمبر تشریف لائے ہیں

لِكُلِّ أُمَّةٍ رَسُوْلٌ (یونس۔47)

''ہر ایک امت کی طرف رسول بھیجا گیا''

لِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ (الرعد۔7)

''ہر قوم کے لئے رہنما ہے''

ایک حدیث بھی عموماً بیان کی جاتی ہے جس میں انبیاء کرام علیہم السلام کی تعداد ایک لاکھ چوبیس ہزار بیان کی گئی ہے۔ اس حدیث مبارکہ کا متن اور ترجمہ یہاں درج کیا جاتا ہے۔

كَانَ النَّبِيُّ ﷺ فِي الْمَسْجِدِ جَالِسًا وَ كَانُوْا يَظُنُّوْنَ اَنْ يَّنْزِلَ عَلَيْهِ فَأَقْصَرُوْا عَنْهُ حَتّٰى جَاءَ أَبُوْذَرٍّ فَاقْتَحَمَ فَجَلَسَ اِلَيْهِ۔ فَأَقْبَلَ عَلَيْهِ النَّبِيُّ ﷺ فَقَالَ: يَا أَبَاذَرّ هَلْ صَلَّيْتَ الْيَوْمَ؟ قَالَ لَا، قَالَ قُمْ فَصَلِّ۔ فَلَمَّا صَلّٰى أَرْبَعَ رَكَعَاتِ الضُّحٰى أَقْبَلَ عَلَيْهِ فَقَالَ يَا أَبَاذَرّ تَعَوَّذْ بِاللّٰهِ مِنْ شَرِّ شَيَاطِيْنِ الْجِنِّ وَ الْاِنْسِ، قَالَ يَا نَبِيَّ اللّٰه وَ لِلْاِنْسِ شَيَاطِيْنُ؟ قَالَ نَعَمْ [شَيَاطِيْنُ الْجِنِّ وَ الْاِنْسِ يُوْحِيْ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا] ثُمَّ قَالَ يَا أَبَاذَرّ أَلَا أُعَلِّمُكَ كَلِمَاتٍ مِنْ كَنْزِ الْجَنَّةِ؟ قُلْتُ بَلٰى

جَعَلَنِیَ اللّٰہُ فِدَائَکَ۔ قَالَ: قَلْ لَاحَوْلَ وَلَاقُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہ۔ قُلْتُ لَاحَوْلَ وَلَاقُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہ، قَالَ ثُمَّ سَکَتَ عَنِّی فَاسْتَبْطَأْتُ کَلَامَہٗ قَالَ قُلْتُ یَانَبِیَّ اللّٰہ اِنَّا کُنَّا أَھْلَ جَاھِلِیَّۃٍ و عِبَادَۃَ أَوْثَانٍ فَبَعَثَکَ اللّٰہُ رَحْمَۃً لِّلْعَالَمِیْنَ أَرَأَیْتَ الصَّلَاۃَ مَا ھِیَ؟ قَالَ خَیْرُ مَوْضُوْعٍ مَنْ شَاءَ اسْتَقَلَّ وَ مَنْ شَاءَ اسْتَکْثَرَ۔ قُلْتُ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ أَرَأَیْتَ الصِّیَامَ مَاذَا ھُوَ؟ قَالَ فَرْضُ مُجْزِئٌ قَالَ قُلْتُ یَا نَبِیَّ اللّٰہِ أَرَأَیْتَ الصَّدَقَۃَ مَاھِیَ؟ قَالَ أَضْعَافٌ مُضَاعَفَۃٌ وَ عِنْدَ اللّٰہِ الْمَزِیْدَ۔ قَالَ قُلْتُ یَانَبِیَّ اللّٰہِ! فَأَیُّ الصَّدَقَۃِ أَفْضَلُ قَالَ: سِرٌّ اِلٰی فَقِیْرٍ وَ جُھْدٌ مِنْ مُقِلٍّ۔ قُلْتُ یَا نَبِیَّ اللّٰہِ اَیُّمَا اُنْزِلَ عَلَیْکَ اَعْظَمُ قَالَ [اَللّٰہُ لَا اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ] آیَۃ الْکُرْسِیِّ۔ قُلْتَ یَا نَبِیَّ اللّٰہِ أَیُّ الشُّھَدَاءِ اَفْضَلُ؟ قَالَ مَنْ سَفَکَ دَمُہٗ وَ عَقَرَ جَوَّادُہٗ۔ قُلْتُ یَا نَبِیَّ اللّٰہِ فَأَیُّ الرِّقَابِ اَفْضَلُ قَالَ أَغْلَاھَا ثَمَنًا وَ اَنْفُسُھَا عِنْدَ اَھْلِھَا۔ قَالَ قُلْتُ یَا نَبِیَّ اللّٰہِ أَیُّ الْاَنْبِیَاءِ کَانَ اَوَّلُ؟ قَالَ آدَمُ علیہ السلام قَالَ قُلْتُ یَا نَبِیَّ اللّٰہِ وَ نَبِیٌّ کَانَ آدَمُ؟ قَالَ نَعَمْ نَبِیٌّ مُکَلَّمٌ خَلَقَہُ اللّٰہُ بِیَدِہٖ وَ نَفَخَ فِیْہِ مِنْ رُّوْحِہٖ ثُمَّ قَالَ لَہٗ یَا آدَمُ قبلاً۔ قَالَ قُلْتُ یَا نَبِیَّ اللّٰہِ کَمْ عَدَدُ الْاَنْبِیَاءِ قَالَ **مِائَۃُ أَلْفٍ وَ أَرْبَعَۃٌ وَّ عِشْرُوْنَ أَلْفًا** اَلرُّسُلُ مِنْ ذَالِکَ ثَلَاثَ مِائَۃٍ وَ خَمْسَۃَ عَشَرَ جَمًّا غَفِیْرًا

(الراوی: ابوامامۃ الباھلیؓ۔ المحدث: الھیثمی۔ المصدر: مجمع الزوائد۔ مدارہ علی علی بن زید و ھو ضعیف)

''رسول اللہ ﷺ مسجد میں تشریف فرما تھے اور لوگ سمجھتے تھے کہ آپ پر وحی نازل ہوتی ہے اس لیے لوگ آپ سے (احتراماً) سہمے سہمے رہتے تھے یہاں تک کہ ابوذر رضی اللہ عنہ آئے اور جا کر حضور ﷺ کے پاس بیٹھ گئے۔ نبی اکرم ﷺ ان کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا: اے ابوذر! کیا تم نے آج نماز پڑھی ہے۔ انہوں نے عرض کیا کہ نہیں۔ فرمایا کہ اٹھو اور نماز پڑھو۔ انہوں نے چاشت کی چار رکعات پڑھیں۔

تو حضور ﷺ ان کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا کہ اے ابوذر! اللہ تعالیٰ کی پناہ طلب کرو جنوں اور انسانوں کے شیطانوں کے شر سے۔ انہوں نے عرض کیا کہ اے اللہ کے نبی! کیا انسانوں میں بھی شیطان ہوتے ہیں؟ آپ نے فرمایا: ہاں، ''جنات اور انسانوں کے شیاطین دھوکہ دینے کے لئے ایک دوسرے کے دل میں ملمع کی ہوئی باتیں ڈالتے رہتے ہیں''۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا اے ابوذر! میں تمہیں ایسے کلمات نہ سکھاؤں جو جنت کے خزانے میں سے ہیں؟ میں نے عرض کیا، کیوں نہیں، اللہ مجھے آپ پر قربان کردے۔ آپ نے فرمایا کہ کہو لَا حَوْلَ وَ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰہ۔ میں نے کہا لَاحَوْلَ وَ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰہ۔ پھر آپ خاموش ہوگئے۔ میں نے سوچا کہ دیر ہوگئی آپ نے کوئی بات نہیں کی۔ تو میں نے عرض کیا: اے اللہ کے نبی! ہم جاہل لوگ تھے اور بتوں کو پوجتے تھے پھر اللہ تعالیٰ نے آپ کو رحمت للعالمین بنا کر بھیجا، آپ کے خیال میں صلوٰۃ (نماز) کیا ہے؟ آپ نے فرمایا: بہترین عمل ہے، جو چاہے کم پڑھے اور جو چاہے زیادہ پڑھے۔ میں عرض کیا اے اللہ کے رسول! روزے کے بارے میں آپ کیا کہتے ہیں؟ آپ نے فرمایا فریضہ ہے جس کا بدلہ دیا جاتا ہے۔ میں نے پوچھا کہ صدقہ کے بارے میں آپ کیا کہتے ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا دگنا چوگنا کر دیا جاتا ہے اور اللہ کے ہاں اس سے زیادہ ہے۔ ابوذر کہتے ہیں میں دریافت کیا اے اللہ کے نبی کون سا صدقہ افضل ہے؟ آپ نے فرمایا: محتاج کو چھپا کر دینا اور تنگ دست کا مشقت اٹھانا۔ میں دریافت کیا اے اللہ کے نبی! آپ پر جو کچھ نازل ہوا ہے اس میں سب سے عظیم چیز کیا ہے؟ آپ نے فرمایا:[اللہ لا الٰہ الا ھو الحی القیوم .....] آیت الکرسی۔ میں دریافت کیا اے اللہ کے نبی! شہداء میں سے کون افضل ہے؟ آپ نے فرمایا: جس کا خون بھی بہہ جائے اور تیز رفتار گھوڑا بھی کاٹ دیا جائے۔ میں نے پوچھا اے اللہ کے نبی! کون سا غلام (آزاد کرنا) افضل ہے؟ فرمایا جس کی قیمت زیادہ ہو اور اپنے گھر والوں کو مرغوب ہو۔ میں نے دریافت کیا اے اللہ کے نبی سب سے

پہلے نبی کون تھے؟ آپ نے فرمایا آدم علیہ السلام۔ میں عرض کیا کہ کیا آدم نبی تھے؟ فرمایا جی ہاں، وہ ایسے نبی تھے جن سے اللہ تعالیٰ ہم کلام ہوا اور اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنے ہاتھ سے بنایا پھر ان میں اپنی روح پھونک دی پھر ان سے فرمایا: اے آدم.....۔ میں نے دریافت کیا اے اللہ کے نبی انبیاء علیہم السلام کی تعداد کتنی ہے؟ آپ نے فرمایا: ایک لاکھ چوبیس ہزار کا جم غفیر ہے، جن میں سے تین سو پندرہ رسول ہیں۔''

یہ حدیث مسند احمد میں بھی تقریباً انہیں الفاظ کے ساتھ مذکور ہے۔ اور مستدرك على الصحيحين میں درج ذیل الفاظ آئے ہیں

قلت يا رسول الله كم النبيون قال مائة الف و اربعة و عشرون الف نبی۔ قلت كم المرسلون منهم؟ قال ثلاث مائة و ثلاثة عشر

''میں دریافت کیا اے اللہ کے رسول انبیاء کتنے ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ایک لاکھ چوبیس ہزار۔ میں نے پوچھا ان میں سے رسول کتنے ہیں؟ آپ نے فرمایا: تین سو تیرہ۔''

تفسیر قرطبی میں سورۃ البقرۃ آیت 213 کے ذیل میں لکھا ہے

جملتهم مائة و اربعون الفا، الرسل منهم ثلاث مائة و ثلاثة عشر و المذكورون فى القرآن بالاسم العلم ثمانية عشر

''تمام انبیاء ایک لاکھ چوبیس ہزار ہیں ان میں سے رسول تین سو تیرہ ہیں اور قرآن مجید میں اٹھارہ (رسولوں) کا ذکر ان کے نام کے ساتھ ہوا ہے۔''

صلوات اللہ وتسلیماتہ علیٰ جمیع الانبیاء والمرسلین

قابلِ تقلید

خلیفہ راشد

# حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ

# کا ایک سبق آموز واقعہ

حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ ایک بار رات کو رجاء بن حیواۃ سے گفتگو فرما رہے تھے کہ دفعتہً چراغ جھلملانے لگا، پہلو ہی میں ایک ملازم سویا ہوا تھا، رجاء نے کہا اس کو جگا نہ دوں؟ بولے سونے دو۔ انہوں نے کہا 'میں خود اُٹھ کر چراغ کو ٹھیک کر دوں'' فرمایا ''مہمان سے کام لینا مروّت کے خلاف ہے''، بالآخر چادر رکھ کر خود ہی اُٹھے، برتن سے زیتون کا تیل لیا اور چراغ کو ٹھیک کر کے پلٹے تو کہا ''جب میں اٹھا تھا تب بھی عمر بن عبدالعزیز تھا اور جب لوٹا تب بھی عمر بن عبدالعزیز ہوں''۔

(سیرت عمر بن عبدالعزیز، مؤلف مولانا عبدالسلام ندوی)

ان شاءاللہ

قرآن اکیڈمی جھنگ

## میں خواتین کے لئے

## ہفتہ وار تربیتی نشست

مقام خواتین ہال قرآن اکیڈمی جھنگ

دن منگل

وقت صبح 09.00 بجے سے 11.30 بجے تک

پروگرام

☆ درسِ قرآن ☆ مطالعہ حدیث

☆ مطالعہ سیرت النبی ﷺ ☆ سیر صحابیات

☆ دینی لٹریچر ☆ اظہارِ خیال ☆ ریفریشمنٹ

شرکت کی دعوت عام ہے

شعبہ تربیت

قرآن اکیڈمی جھنگ لالہ زار کالونی نمبر 2، ٹوبہ روڈ جھنگ صدر

047-7628561

برطانوی ہند کے مسلمانوں کی صد سالہ
جدوجہد کے بارے میں کئی اقساط میں
شائع شدہ سلسلہ مضامین کتابی شکل میں زیر طبع ہے

# جنوبی ایشیا میں مسلم بیداری کے

# سو (100) سال

# (1910ء۔2010)

جو تین عظیم عالمی مغربی سپر طاقتوں کو
فنا کے گھاٹ اتارنے کا باعث بن گئے

انجینئر مختار فاروقی

صفحات: 150 مجلد سفید کاغذ

مکتبہ قرآن اکیڈمی جھنگ